SHAMEEM AHMED SHAMEEM

BAHASYAT SAHAFI

(A dissertation submitted the university of Hyderabad in partial
Fulfillment of the requirement of the award of degree)

MASTER OF PHILOSOPHY

IN URDU

Submitted
By

MOHAMMAD YOUSAF
Reg. No: 18HUHL05

Supervisor
Prof. A.M SYED FAZLULLAH

DEPARTMENT OF URDU, SCHOOL OF HUMANITIES
UNIVERSITY OF HYDERABAD
HYDERABAD 500046
2019

شمیم احمد شمیمؔ : بحیثیت صحافی

(مقالہ برائے ایم فل)

مقالہ نگار

محمد یوسف

(رجسٹریشن نمبر۔18HUHL05)

2019

زیر نگرانی

پروفیسر سیّد فضل اللہ مکرّم

شعبہ اردو، سکول آف ہیومینٹیز، یونیورسٹی آف حیدرآباد

DEPARTMENT OF URDU, SCHOOL OF HUMANITIES
UNIVERSITY OF HYDERABAD
HYDERABAD 500046
2019

DECLARATION

I, MOHAMMAD YOUSAF Her by declare that this dissertation entitled "SHAMEEM AHMED SHAMEEM BAHASYAT SAHAFI" Submitted by me under the guidance and supervision of Prof. A.M. SYED FAZLULLAH is a bonafide research work is also free from plagiarism. I also declare that it has been submitted previously in part or in full to this university or any other institution for award of any degree or diploma . I hereby agree that my thesis can be deposited in shodganga/INFLIB NET.

DATE

Name: MOHAMMAD YOUSAF

Signature of the Student
Reg. No: 18HUHL05

CERTIFICATE

This is to certify that the dissertation entitled " SHAMEEM AHMED SHAMEEM BAHASYAT SAHAFI" Submitted by MOHAMMAD YOUSAF bearing Registration no. 18HUHL05 in partial fulfillment of the requirement for the award of degree of master of philosophy in Urdu is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance

This dissertation has not been submitted previously in part or full to this university or any other university or institution for the award of any degree or diploma.

He has presented an article in the fallowing conference " SIR SAYED AHMED KHAN KI SAHAFTI KHIDMAT" Presented in one day national seminar on 27th March 2019. (copy of the certificate enclosed)

Signature of the supervisor

HEAD OF THE DEPARTMENT

DEAN

SCHOOL OF HUMANITIES

فہرست۔

پیش لفظ۔ ۴

باب اوّل۔ ۶

جموں وکشمیر میں اردو صحافت کی تاریخ

(ابتداء سے ۱۹۶۴ء)

باب دوم۔ ۳۶

شمیم احمد شمیمؔ کی حالاتِ زندگی، اور شخصیت

باب سوم۔ ۷۰

شمیم احمد شمیمؔ: بحیثیت صحافی

(الف)۔آئینہ ایک تعارف

۱۔ آئینہ اخبار کی پالیسی۔

۲۔ہفتہ وار آئینہ۔

(ب) ۔ شمیم احمد شمیمؔ کی خاکہ نگاری

(ج) ۔ شمیم احمد شمیمؔ کی کالم نگاری

(د) ۔ شمیم احمد شمیمؔ کی اداریہ نگا ری

ماحاصل۔ ۱۵۰

کتابیات۔ ۱۵۷

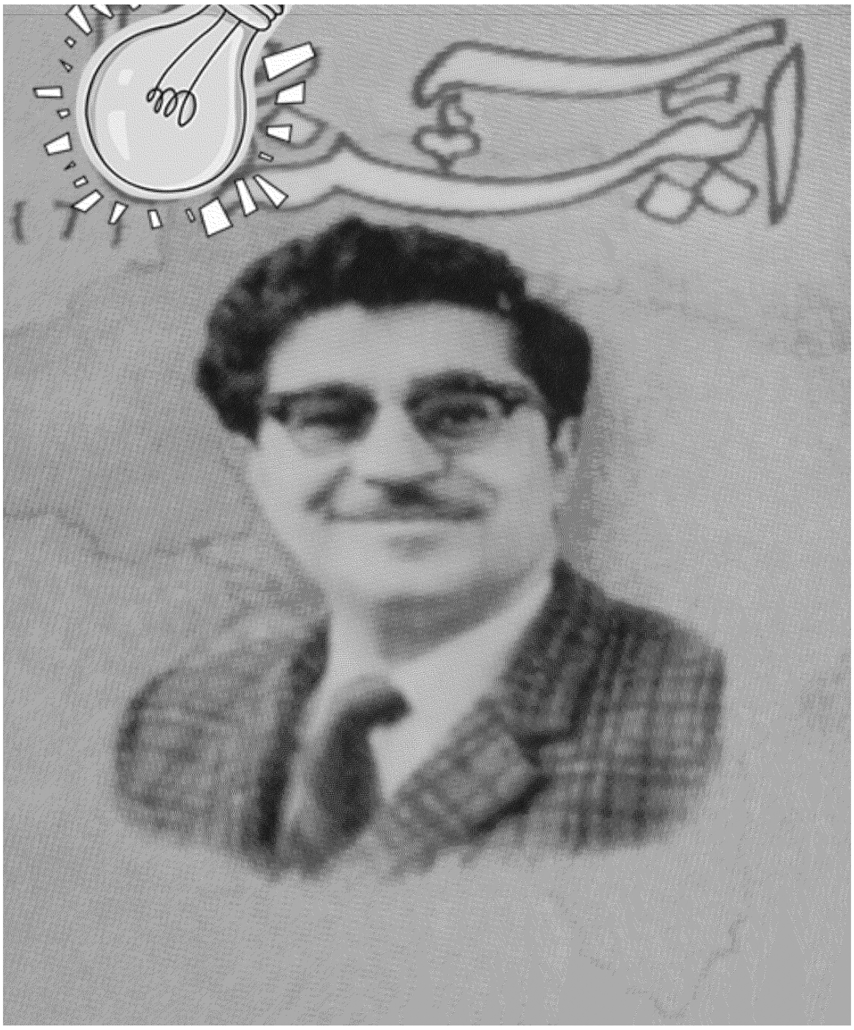

شمیم احمد شمیم

پیش لفظ۔

انسان نے دنیا میں آتے ہی نئی سے نئی تخلیق سے یہ بات ثابت کی ہے کہ انسان ازل سے ہی کھوج اور پرکھ کا خواہاں رہا ہے۔انسان کی یہ تحقیقی صلاحیت ہی اس کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیتی ہے۔ یہ تحقیق کی صلاحیت ہی ہے جس نے انسان کو آگ پیدا کرنے سے لے کر جدید ترین ٹکنالوجی تک کا درس دیا۔

اسی تحقیق کا ایک حصہ یہ مقالہ بھی ہے دراصل میرے دو پسندیدہ موضوعات ہیں ایک شاعری دوسرا صحافت۔صحافت کا سفر بی۔اے سال اوّل سے ہی شروع ہو گیا تھا۔تقریباً ۲۰۱۳ میں اخبارات کے لئے لکھنا شروع کیا اور میرا پہلا مضمون ''کشمیر عظمیٰ'' میں ''قوم کو سیکولیرزم وترقی کے نام دھوکہ'' شائع ہوا،تب سے یہ سفر رواں دواں ہے اور دوسرا پسندیدہ موضوع شاعری پر انشااللہ پی ایچ ڈی کا کام کیا جائے گا۔

صحافت نام سے واقفیت ۲۰۱۲ میں ہوئی اور ایسا بھوت سوار ہوا کہ رات دن اسی کے خواب دیکھتا اور لکھتا ۔قارئین نے حوصلہ افزائی فرمائی اور مزید حوصلے بلند ہوئے قدرت مہربان ہوئی تو دہلی میں دو سال گزارنے کا موقع ملا جہاں صحافت کو بہت قریب سے دیکھا اور مختلف اخبارات اور ٹی وی چینلوں کے دفاتر کا معائینہ کیا۔ جے این یو نے خون اور اور بھی گرمایا اور ساتھ ہی ساتھ حالات حاضرہ نے بھی اسی میدان پر ڈٹے رہنے کی تلقین کی۔دہلی نے زیادہ دیر کی مہلت نہ دی اور دکن کا رُخ کیا یہاں بھی خوش قسمتی سے ایک ایسے پروفیسر کی نگرانی نصیب ہوئی جو خود صحافت مین ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔پیاسے کو سمندر مل گیا۔مختلف موضوعات پر غور وفکر کرنے کے بعد ایک ایسا موضوع ہاتھ لگا جس پر میرے نگران پروفیسر سیّد فضل اللہ مکرّم بھی متفق ہو گئے اردو صحافت کی صفِ اوّل سے تعلق رکھنے والے ایک عظیم صحافی شمیم احمد شمیمؔ پر تحقیقی کام کرنے کا موقع ملا۔

میں نے اپنے مقالے کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے،اور اپنے نگران کے مشورے پر اسے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔پہلا باب ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو صحافت کی تاریخ'' ابتدا سے ۱۹۶۴ء تک،ہے اس باب میں ریاست جموں وکشمیر میں اردو صحافت کی تاریخ کا اجمالی جایزہ پیش کیا گیا ہے۔باب دوم میں شمیم احمد شمیمؔ کی حالات زندگی اور شخصیت کو مفصّل بیان کیا گیا ہے۔ باب سوم میں شمیم احمد شمیمؔ کی صحافتی خدمات کو بیان کیا گیا ہے جو کہ میرے مقالے کا اصل موضوع بھی ہے۔ابتداء میں ہفت روز'' آئینہ'' کا تعارف پیش کیا گیا ہے اس کے بعد شمیم احمد کی خاکہ

نگاری، کالم نگاری، اداریہ نگاری، اخبار کی پالیسی، روزنامہ آئینہ کو مفصل بیان کیا گیا ہے۔

اپنے تحقیقی کام کی ابتدأ کشمیر میں ایڈوکیٹ ظفر معراج سے ایک انٹرویو لے کر کی جو کہ شمیم احمد شمیم کے منہ بولے بیٹے اور بھانجے بھی ہیں۔ ریاست بھر کی لائبریریوں اور ادبی اداروں سے اپنا بنیادی ماخذ تلاش کر کے کام شروع کیا۔ ''شمیم احمد شمیم بحثیت صحافی'' موضوع کو حقائق کی روشنی میں بازیافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو آج بحمداللہ مکمل ہو گیا۔

اپنے تحقیقی مقالے کو مکمل کرنے میں مجھے میرے والد محترم محمد حسین شاشی اور والدہ عائشہ بیگم کی نیک دعاؤں کا ساتھ رہا۔ میری ہر ایک ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ کسی بھی قسم کے بوجھ سے میرے کندھوں کو آزاد رکھا اللہ ان کی عمر صحت کے ساتھ دراز فرمائے۔

میرے نگراں پروفیسر سیّد فضل اللہ مکرّم نے جس طرح سے میرے تحقیقی کام کی نگرانی کر کے اسے پائیہ تکمیل تک پہنچایا میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں کہ میں ان کی تعریف میں کچھ لکھ سکوں۔ پروفیسر صاحب نے کبھی بھی کوئی پابندی نہیں لگائی بلکہ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ بیٹا اگر رات دن میں جب بھی کوئی معلومات حاصل کرنی ہوں تو میرا دروازہ اور فون دونوں کُھلے ہیں دعا ہے کہ اللہ ہر نگران کو ان جیسے اوصاف عطا کرے۔

میرے محبین، دوست احباب ہم جماعت میں عبدالرّزاق شاشی، جاوید احمد بزمی، خالد چودھری، مسعود اظہر، زبیر احمد، نہاں نورین، مشوری حسن اور شمیمہ شاشی کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے تحقیقی کام میں مدد کی اور اس موقعے پر اپنی چاروں بہنوں کو بھلانا نہایت ہی ناانصافی ہوگی کی جنہوں نے ہمیشہ اپنے اس بھائی کے اسکول جانے سے پہلے اپنی پوشاک سے جوتے صاف کئے اور ا،یک بڑا آدمی بننے کے خواب دکھائے اللہ انہیں شاد و آباد رکھے نیز اپنے بھائیوں کا بھی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے مجھے گھر سے فارغ رکھا اور نیک دعاؤں میں یاد رکھا۔ اور خصوصی طور سے اپنے چچا جان، محترم خادم الاسلام شاشی کا مشکور ہوں کہ جنہوں نے مجھے ہمیشہ اپنے مقصد پر ڈٹے رہنے کی تلقین کی اور وقتاً فوقتاً ہر طرح کی مدد بھی کرتے ہے۔ اپنے تمام اساتذہ کا بھی شکرہ کہ جنہوں نے مجھے اپنی بہترین رائے سے نوازا۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر حبیب نثار صاحب کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے میرے موضوع سے متعلق کتابیں مہیّا کیں۔ یہ طالبِ علم کی پہلی کوشش ہے امید کرتا ہوں کہ آپ کو میرا یہ تحقیقی کام پسند آئے گا۔

محمد یوسف شاشی

بابِ اوّل

ریاست جموں و کشمیر میں اردو صحافت کی تاریخ۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو صحافت کی تاریخ

ابتدا سے ''آئینہ'' 1964ء تک (ایک جائزہ)

جموں و کشمیر کی صحافت کا سفر انیسویں صدی کے نصف کے بعد شروع ہوتا ہے۔اس سفر کے دوران کشمیر میں درجنوں نامور صحافی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی بے باک تحریر کو عوام کے پیش نظر کیا۔انیسویں صدی کے نصف سے پہلے ریاست جموں و کشمیر کے بادشاہوں کے نظام میں وقائع نویسی کے لئے باقاعدہ عملہ ہوا کرتا تھا۔جو بڑی سرگرمی سے وقائع فراہم کرتا تھا۔ یہ وقائع نگار سلطنت کے مختلف علاقوں کے حالات قلم بند کرتے تھے اور اپنی قلمی رپوٹیں جنہیں ''اخبار'' کہا جاتا تھا بادشاہ کو مہیا کرتے تھے ان کے مرتب کئے ہوئے ''اخبار'' دربار کے اندرونی حلقوں میں تو گشت کرتے ہی تھے لیکن عوام کی دسترس سے باہر ہوتے تھے ان کا مقصد صرف بادشاہ کو اپنی سلطنت کے حالات سے باخبر رکھنا ہوتا تھا۔

ریاست جموں و کشمیر کا قیام انیسویں صدی عیسوی میں عمل میں آیا۔جب کہ جموں خطّے کا قیام 1820ء میں ہوا۔اس میں کشمیر، لداخ اور گلگت کا شمول 1846ء میں ہوا پہلا چھاپہ خانہ 1858ء میں ڈوگرہ حکومت کے زیر اہتمام قائم ہوا۔ یہ پریس جس میں فارسی اور دیوناگری حروف میں طباعت کا انتظام تھا۔ریاست کی موجودہ سرماء راجدھانی جموں میں تھی۔ یہاں فارسی اور سنسکرت کے علاوہ اردو میں بھی کچھ سرکاری فارم اور دستاویزات چھپتے تھے۔

اب تک ریاست کے علاوہ باقی ہندوستان میں کئی سرکاری اور غیر سرکاری مطابع قائم ہو چکے تھے۔اور ملک کے کئی حصوں سے اردو اخبار بھی چھپ رہے تھے۔لیکن ریاست جموں و کشمیر سے ابھی تک کوئی اخبار جاری نہیں ہوا تھا اور یہاں تک کہ ریاست کے دوسرے حکمران مہاراجہ رنبیر سنگھ زیب سلطنت بنے اور علوم وفنون کو بھی ترقی کی راہ نصیب ہوئی۔مہاراجہ نے ایک چھاپہ خانہ قائم کیا اور ساتھ ہی ساتھ ریاست میں علمی فضائیں قائم کرنے کی تدبیریں کیں انہوں نے مقامی اہل قلم کی ہمت افزائی کی اور ساتھ ہی ساتھ دور دور سے ادیبوں اور قلم کاروں کو بلا کر ریاست میں علمی اور ادبی کاموں پر مامور کیا۔

1846ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے والد مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں عمل داری کے مختلف حصے ایک واحد انتظامیہ میں متحد ہو گئے تھے۔جس سے یہ سرزمین بہتر ریاست بن گئی۔اس کے حصہ جموں کی مادری زبانوں میں ڈوگری ،گوجری،چھبالی،لہندا،پہاڑی،پنجابی اور کشمیری شامل تھیں۔حصہ کشمیر کی مادری زبانوں میں کشمیری اور اس کی مختلف بولیاں تھیں۔اور حصہ لدّاخ میں لدّاخی،اور اس کی مختلف بولیاں تھیں اس سب کے باوجود ڈوگرہ حکومت نے اپنی روایت سے کام لیتے ہوئے سرکاری اور عدالتی سطح پر فارسی زبان رائج کی تھی لیکن اس کا استعمال اعلیٰ سطح تک ہی محدود تھا۔

ایک شخص جو کسی بھی سیاسی نظام پر انحصار کرتا ہوا پنی مادری اور عدالتی زبان کے علاوہ اسے ایک ایسی زبان کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی بیرونی دنیا اور مجلسی تعلق کی راہیں مضبوط کرے یہی زبان اسے گھریلو سطح سے آگے وسیع تر سطح پر موثر بناتی ہے یہی وجہ ہے کہ مادری زبان کے ہوتے ہوئے بھی عوام الناس کے میل جول سے نشو نما پانے والی زبان مختلف طبقوں کو نزدیک لانے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ریاست جموں وکشمیر کی عوامی بول چال میں مختلف زبانوں کا استعمال ہوتا تھا جو اردو ہی کی ایک شکل تھی۔مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں یہ نثر نگاری میں شامل ہو چکی تھی۔اور ڈوگری اور ہندی کے شانہ بہ شانہ ترجمے کی زبان بن گئی تھی ساتھ ہی ساتھ مہاراجہ نے ایک انجمن بھی قائم کی جس کا مقصد مختلف زبانوں کے ادبی شہ پاروں کا اردو اور ہندی میں ترجمہ کرنا اور ان سے متعلق تنقیدی اور تاریخی مباحث کو چھیڑنا تھا۔

ریاست جموں وکشمیر کا پہلا پریس اور اخبار۔

ریاست میں چھاپہ خانوں کا آغاز بہت پہلے 1858ء میں ہو چکا تھا۔ریاست کا سب سے پہلا پریس ''احمدی پریس'' تھا جس کے کئی سال بعد ''وکرم ولاس پریس'' کے نام سے ایک سرکاری پریس لگایا تھا۔جس نے شروع شروع میں اردو زبان کی ترویج میں مدد کی تھی اس زمانے میں کوئی اخبار شائع نہیں ہو سکا تھا لیکن اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔چند سال بعد ریاست کی موجودہ راجدھانی جموں میں ''بدیابلاس'' پریس اور سری نگر میں سالگ رام پریس کے ناموں سے دو الگ الگ پریس قائم ہوئے ان دونوں میں اردو کی طباعت کا انتظام تھا۔جموں کے اس پریس سے 1867ء میں ''بدیابلاس'' ہی کے نام سے ریاست کا سب سے پہلا مطبوعہ اخبار جاری ہوا جو کہ ہفت روزہ

تھا۔جس کے دائیں کالم میں اردواور بائیں کالم میں ہندی میں مواد شائع ہوتا تھا۔اس اخبار کی ضخامت آٹھ صفات پرمشتمل تھی۔ وہیں دوسرا اخبار ہفت روزہ ''تحفہ کشمیر'' جس کے مالک ہرسکھ رائے تھے۔جو1876ء میں منشی جمنا پرسادکی ادارت میں سری نگر سے نکلا کرتا تھا۔اس کے مالک ہرسکھ رائے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے گہرے دوست تھے۔

15 مارچ1846ء تک کشمیر کا علاقہ پنجاب کے سکھ اقتدار کی عمل داری میں تھا اس اقتدار کے زوال کے بعد سولہ مارچ1846ء کو برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ناظم جموں راجہ گلاب سنگھ کے ساتھ امرت سر کے مقام پر ہونے والے معاہدے کے تحت جموں وکشمیر کی نئی ریاست وجود میں آئی جو اس دور کی بڑی اہم خبر تھی۔جس کا چرچا اس وقت پورے ملک بالخصوص پنجاب میں ہورہا تھا۔

برٹش گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ کے مطابق انگریزوں نے راجہ گلاب سنگھ سے جو جموں کے ڈوگرہ شاہی خاندان کا رکن تھاراوی سے سندھ تک کے پہاڑی اضلاع بہ شمول صوبہ کشمیر پر مشتمل ایک نئی ''راجپوت ریاست'' تشکیل دینے کا معاہدہ برطانوی حکومت کے حال اور مستقبل کے استحکام اور تحفظ کے لئے کیا اس معاہدے کے بعد مہاراجہ گلاب سنگھ نے جموں وکشمیراورلداخ کوایک واحد ریاست میں متحد کیااورموجودہ جموں وکشمیر کی ریاست کی بنیاد ڈالی۔اس اتحاد کی بدولت ریاست اس قابل ہوئی کہ فارسی اور علاقائی زبانوں کے آمیزے سے مرتب ہونے والی اردوزبان کے وسیلے سے ریاست کے تمام حصوں میں لسانی اورتہذیبی رابطے ہموار کرے اس سے قبل ہر حصے کےعوام الناس اپنی اپنی مادری زبان سے وابستہ تھےاورعلمی زندگی کی ڈگرا الگ الگ تھی۔

دھرم درپن

دھرم درپن کے نام سے ایک پندرہ روزہ جرنل1873ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے محکمہ تعلیم نے جاری کیا۔جو کہ 16 صفحات پرمشتمل تھا۔اس میں بھی بدیا بلاس کی طرح دوزبانیں تھیں اردواور ہندی،اس کا مقصد عوام کو سرکاری اطلاعات بہم پہنچانا تھا۔اس کے بعد 1884ء میں ایک سرکاری آفیسر نے سری نگر سے جموں گزٹ کے نام سے ایک جریدہ نکالا جس کوسرکاری گزٹ کا ہی درجہ حاصل تھا۔

وہیں انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں ''لدّاخ اخبار''اوربیسویں صدی کے ابتداء میں ''لدّاخ پھوئیاں''

کے نام سے اخبار جاری ہوئے ۔لیکن دونوں لدّاخی زبان میں تھے ۔جو کہ بدھ اور عسائیوں کے پرچار کا ذریعہ تھے ۔

بہر حال یہ تمام اخبارات 1905ء تک بند ہو چکے تھے ۔جس کا تمام ریکارڈ ہمیں ایک سرکاری دستاویز سے ملتا ہے ۔اس میں ریاست کی کونسل نے ریاست کے معاون اور ریزیڈنٹ کمشنر کے ایک مراسلے کے جواب میں بتایا کہ دسمبر 1905ء تک ریاست میں کوئی اخبار شائع نہیں ہورہا تھا ۔البتہ 1905ء میں کشمیر کے میرواعظ مولوی رسول شاہ نے سری نگر میں انجمن نصرت الاسلام قائم کی تو اس انجمن نے ''حالات وروداد'' کے عنوان سے ایک رسالہ جاری کیا تھا ۔یہ ایک سالانہ اشاعت تھی اس کی حیثیت ایک رپورٹ کی سی تھی ،اس کی طباعت لاہور سے ہوئی تھی ۔

ڈوگرہ گزٹ ۔

ڈوگرہ سبھا جموں 1903ء جس کے صدر جناب جیوتشی بشیش پرشاد تھے انہوں نے ''ڈوگرہ گزٹ'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا تھا جس کے اڈیٹر لالہ ہنس راج تھے ۔ڈوگرہ سبھا ایک اصلاح پسند اور نیم سیاسی جماعت تھی لیکن بنیادی طور پر ڈوگرہ حکمران کی حامی تھی ۔اس لئے ان کا اخبار بھی سرکار کی پیروی کرتا رہا ۔یہ تمام اخبارات جن کا ابھی تک ذکر کیا گیا یا تو سرکاری جریدے تھے یعنی سرکاری سرپرستی حاصل تھی بات دراصل یہ تھی کہ ایک اخبار کے اجرا کے معاملے میں دیسی ریاستیں اپنے ہاں متعیّن وائسرائے کے ایجنٹ کی نظر کرم کی محتاج تھیں ۔عام طور پر یہ آزاد صحافت کی کوئی روایت قائم کرنے کی کوشش نہیں تھی ۔اس معاملے میں جموں وکشمیر کی ریاست سب سے آگے تھی ۔مہاراجہ نجی اخبار نکالنے کی اجازت نہیں دیتا تھا ۔وہ اسے بغاوت پیدا کرنے کی تدبیر تصور کرتا تھا ۔

سرکار کے اس سخت روّیے کی وجہ سے کئی اہل علم اور دانشور ریاست چھوڑ گئے تھے ۔ان کے علاوہ اس دور کے تعلیم یافتہ پنڈتوں کا ایک طبقہ ڈوگرہ حکومت کے خلاف تھا کہ انہوں نے نسبتاً کم تعلیم یافتہ اقارب اور بیرون ریاست کے منتخب افراد کو کشمیر کی انتظامیہ میں اعلیٰ عہدوں پر تعینات کردیا تھا ۔

کشمیر میں 1878ء میں ایک زبردست قحط پڑا جس سے ہزاروں کشمیری راجواڑہ شاہی کی غفلت سے موت کا شکار ہوگئے ۔کشمیری پنڈتوں کو اس سے مزید تکلیف ہوئی ان کے جزبات کی ترجمانی کرنے کے لئے ایک دلیر کشمیری ہرگوپال خستہ جس کی کشمیر دربار سے ان بن ہوگئی تھی ۔پڑوسی صوبہ پنجاب کے لاہور چلا گیا تھا ۔وہاں اس

نے راجواڑہ شاہی کی کوتاہیوں پر اخبارات میں مضامین لکھنے کے علاوہ خود بھی کئی اخبار نکالے۔ان میں ''راوی'' ''ریفارمر'' ''خیر خواہ'' اور ''پبلک نیوز'' شامل ہیں۔اس کی تحریروں کی وجہ سے کشمیری سرکار بہت ناراض اور برہم ہوئی۔اس نے خستہ کو ایک مدّت تک باہو قلعے کی قید میں رکھا۔انیسویں صدی کے اس دلاور کشمیری صحافی نے 1872ء میں ''گلدستہ کشمیر'' کے عنوان سے ایک کتاب بھی شائع کی جس میں اہل کشمیر میں اردو زبان کے چلن کی شہادتیں مہیّا کیں۔

خیر خواہِ کشمیر۔

پنڈت سالگ رام کول نے لاہور سے 1884ء میں ہفت روزہ ''خیر خواہ کشمیر'' نکالا۔اس کی ضخامت آٹھ صفحات پر مشتمل تھی۔کشمیری پنڈتوں کے علاوہ کشمیری مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی راجواڑہ شاہی کی پالیسی سے نالاں تھا۔ان کے بھی کئی افراد ریاست چھوڑ کر پنجاب چلے گئے تھے۔1896ء میں انہوں نے لاہور میں ایک کشمیری مسلم کانفرنس (پنجاب) قائم کی جو 1908ء میں آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس میں تبدیل ہوگئی اس جماعت کے پہلے جنرل سکریٹری علامہ اقبالؒ اور معاون سکریٹری منشی محمد دین فوق تھے۔

محمد دین فوقؔ ایک اہم صحافی۔

محمد دین فوق نے کشمیری مسلمانوں کے مسائل اور مفاد پر کئی جریدے جاری کئے انہیں طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر کہنے اور ناول پڑھنے کا بہت شوق تھا۔قلم کے بادشاہ تھے۔بیس سال کی عمر میں 1897ء میں لاہور کے ''پیسہ اخبار'' میں ملازم ہو گئے تھے۔اس کے علاوہ لاہور کے دوسرے اخباروں میں بھی جن میں ''اخبار عام'' ''صدائے ہند'' ''آفتاب پنجاب'' ''کوہ نور'' اور ''اردو اخبار'' ہیں۔مضامین بھی لکھتے رہے اور ادارت بھی فرماتے رہے بعد میں ملازمت چھوڑ دی اور یکے بعد دیگرے اپنے کئی اخبار نکالے اور ایک مطبع بھی قائم کیا۔

پنجہ فولاد۔

یہ فوق صاحب کا ایک اخبار تھا جو 1901ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔شروع میں پندرہ روزہ تھا جو کہ بعد میں ہفتہ وار ہوگیا۔

کشمیری میگزین۔

فوق صاحب نے 1906ء میں ایک ماہانہ رسالہ ''کشمیری میگزین'' نکالا جس کے اعلانیہ مقاصد میں پنجاب کے کشمیری مسلمانوں میں تعلیم، قومی بیداری، حفاظت حقوق، تمدنی ترقی کا شعور پیدا کرنا تھا انہوں نے لکھا کہ ان کی تحریروں کی وجہ سے لاہور میں کشمیری مسلم کانفرنس کا قیام ہوا1906

ہفت روزہ کشمیر۔

ہفت روزہ کشمیر جدید 1932ء میں جاری کیا۔فوقؔ صاحب جن کی پیدائش 1877ء میں پنجاب میں ہوئی۔وہ بیک وقت صحافی، ادیب، شاعر اور مورّخ تھے۔ان کی تصانیف کی تعداد ایک سو کے قریب ہے۔ان کی مشہور تالیف ''اخبار نویسوں کے حالات میں اس دور کے 38 صحافیوں کے حالات زندگی درج ہیں انیسویں صدی میں راجواڑہ شاہی کے آمرانہ روّیے کے خلاف ابھرنے والی آوازیں عام طور پر اردو صحافت کا سہارا لے رہی تھیں لیکن اس صحافت کی پشت پناہی بیرونِ ریاست میں بھی تھی کیوں کہ ریاست کے اندر احتجاجی صحافت ناممکن تھی۔

''مہاجن نیتی پتریکا''۔

ریاست میں 1911ء ''مہاجن نیتی پتریکا'' اور ''ڈوگرہ گزٹ'' کے نام سے دو رسالے جاری ہوئے۔جن میں 1916ء کے آس پاس ''ڈوگرہ اردو گزٹ'' کا اردو اڈیشن بھی نکلا۔ان میں سے ''مہاجن نیتی پتریکا'' مہاجن صدر سبھا کا مستند ترجمان تھا جو حکومت نواز تھا اور ''ڈوگرہ گزٹ'' کی حیثیت بھی عملی طور پر ایک سرکاری گزٹ کی تھی۔

ریاست کے اوّلین حکمران گلاب سنگھ کی بیشتر زندگی مسائل سلجھانے اور معاہداتی علاقوں کو مستحکم کرنے میں گزری۔ان کے بیٹے رنبیر سنگھ نجی صحافت کو فروغ دینے کے داعی تو نہیں تھے لیکن وقت کے علمی اداروں کی روانی میں مددگار رہے۔انہوں نے ریاست کی انتظامیہ محکموں کی جدید کاری کی بھی تدبیریں کیں۔اور ٹیلی گراف یعنی برقی تار کے لئے اردو الفاظ کے استعمال کا حکم دیا۔ان کے فرزند پرتاپ سنگھ نے ریاست میں اردو زبان کی روز افزوں

مقبولیت کے پیش نظر تخت نشینی کے چار ہی سال بعد 1889ء میں اردو کو سرکاری زبان بنا دیا۔انہیں کے زمانے میں گو کافی تردّد کے بعد ریاست کے پہلے نجی اخبار ہفتہ وار ''رنبیر'' کی اجرا کی اجازت ملی۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے جانشین مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنے ناظم امور تعلیم خواجہ غلام السیّدین کی سربراہی میں ریاست کی تعلیمی پالیسی کی اصلاح وتربیت کے لئے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی اس کمیٹی نے ریاست کی زبانوں کا جائزہ لینے کے بعد جو رپوٹ پیش کی اس میں اردو کے بارے میں حسب ذیل سفارش کی گئی۔

''وہ زبان جو تاریخی اور تعلیمی اسباب کی بنا پر ریاست کی عام مشترکہ زبان ہے۔اور ریاست کے مختلف حصّوں میں لوگ جسے بولتے ہیں وہ اردو ہے۔ جو ریاست کے تمام مدرسوں میں پہلے درجہ سے لے کر اوپر تک کے لئے ذریعہ تعلیم بھی ہے اس میں شک نہیں کہ اردو ریاست میں رہنے والوں کی اکثریت کی مادری زبان بھی نہیں ہے لیکن یہ ڈوگری ،لہندا اور پنجابی سے بہت قریب ہے۔ اور ایک حد تک پہاڑی اور گوجری سے بھی ملتی ہے۔ لہیذ ان لڑکوں کے لئے جو یہ زبان نہیں جانتے ہیں اردو کا ذریعہ تعلیم ہونا کوئی دشواری کا سبب نہیں۔ اسی لئے ان علاقوں میں جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے عملاً نیز تعلیمی اعتبار سے اردو کے علاوہ کوئی دوسری زبان زریعہ تعلیم نہیں ہوسکتی اور اردو نہ صرف لغت کے اعتبار سے وسیع اور ترقی یافتہ زبان ہے بلکہ اس میں دوسری زبانوں سے اخذ کر لینے کی صلاحیت بھی موجود ہے''۔[1]

مہاراجہ ہری سنگھ کا دور تمام ڈوگرہ حکمرانوں میں سب سے زیادہ تبدیلی والا دور رہا۔انہیں کے زمانے میں نجی ملکیت کے آزاد اخباروں کا جنم ہوا نہ صرف اخباروں بلکہ نشریاتی اداروں کا بھی آغاز ہوا۔اگر چہ وہ برطانیہ سے ریاست کے معاہدوں کے تحت آزاد پریس کی حوصلہ افزائی کرنے کے روادار نہیں تھے تاہم وہ ہندوستانی اخباروں کی اس اہمیت سے بھی آشنا تھے جو انہوں نے برطانوی ہندوستان میں حاصل کر لی تھی۔انہوں نے ریاست کی اطلاعاتی

ضروریات کی خاطر 1931ء میں اپنا ایک محکمہ پبلیسیٹی قائم کیا جس کی نگرانی اپنے چیف سیکریٹری، ہائی کورٹ کے جج اور ریاست کے وزیر داخلہ کے سپرد کی۔ انیسویں صدی کے آخر میں پنجاب کے جو مقیم دانشور حضرات تھے انہوں نے نجی اخباروں کی ابتدا کی۔ بیسویں صدی کے آغاز ہی میں اس کی گونج شمال مغربی صوبوں میں بھی پیدا ہوئی۔ یہ بات بہت ہی دلچسپ ہے کہ ریاست سے باہر اخبار نکالنے والوں میں اکثر وہ افراد تھے جن کے آبا و اجداد ماضی میں ریاست چھوڑ آئے تھے، اور یہ خود ان کی دوسری یا تیسری نسل سے تھے۔ اسے کہتے ہیں مٹی کا ابدی رشتہ یا نفسیات کی روحانی موسیقی کہ اپنے بزرگوں کے وطن سے باہر پیدا ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے اخباروں اور رسالوں کے کالموں میں اپنی ریاست کی فلاح و بہبود کے نظریے پیش کئے اور باضابطہ اخبارات میں ریاست کے درد و کرب کو بیان کرتے رہے۔

کشمیر درپن۔

پنڈت تیج بہادر سپرو جو کہ 1876ء میں بجنور میں پیدا ہوئے تھے انہوں نے اِلہ باد سے 1903ء میں ''کشمیر درپن'' نکالا جو کہ کشمیری برادری کا آرگن تھا۔ اس میں علمی، اخلاقی، اور تاریخی، مضامین کے علاوہ کشمیری پنڈتوں کی ترقی وفلاح و بہبود کی کوشش کی جاتی تھی کچھ ایسے ہی مقاصد کو محمد دین فوق نے بعد میں لاہور سے جاری کئے جانے والے میگزین ''کشمیری میگزین'' کے لئے پیش نظر رکھے تھے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ کشمیر درپن دو زبانوں میں چھپتا تھا لیکن ہندی 16 صفحوں اور اردو 30 صفحوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ تیج بہادر سپرو کو اردو سے بے پناہ محبت تھی وہ ہائی کورٹ کے وکیل تھے لیکن نجی محفلوں میں اردو میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ ان کی ایک بیماری کے علاج کے لئے بنارس سے ایک نامی وَید کو بلایا گیا لیکن سپرو صاحب ان کی سخت ہندی برداشت نہ کر سکے اور بغیر علاج کرائے ان کو واپس بھیج دیا۔ ایک اور کشمیر الاصل پنڈت برج نارائن چکبست نے 1918ء میں لکھنو سے ''صبح امید'' کی ادارت کی۔ اپنے سابقہِ وطن کشمیر کے بارے میں یوں بیان کیا ہے۔

ذرّہ ذرّہ ہے مرے کشمیر کا مہمان نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

رنبیر۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک ریاست جموں وکشمیر میں کسی ِ نجی اخبار کے اجرا کی اجازت ملنا محال تھی پھر جموں کے ایک نوجوان نے ریاست کے اندر ایک اخبار نکالنے کا عزم کیا۔اس نوجوان کی ذہنی تربیت لاہور کے دو اخباروں ''راجپوت گزٹ'' ''اخبار عام'' اور جلیاں والا باغ کے سانحہ کے قومی ردِّعمل اور مہاتما گاندھی کی عدم تعاون کی تحریک سے ہوئی تھی۔

اس نوجوان جس کا نام ملک راج صراف تھا ولادت اپریل 1894ء کو جموں کی تحصیل سانبہ میں ایک تاجر خاندان میں ہوئی۔دو ہی سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا گھر میں غربت تھی لہذا اسکول کی تعلیم دیر سے شروع ہوئی پڑھنا لکھنا سیکھتے ہی صحافی بننے کا خواب دیکھا۔ 1919ء میں جموں کے ایک کالج سے بی۔اے کیا درمیان میں یہاں وہاں ملازمت بھی کرتے رہے۔1920ء میں لاہور کے ایک کالج میں ایل۔ایل۔بی کے لئے داخلہ لیا لیکن اسی زمانے میں لالہ لاجپت رائے نے اپنا روز نامہ جاری کیا تو قانون کی تعلیم بیچ میں چھوڑ کر'' بندے ماترم'' میں سب اڈیٹر منتخب ہو گئے۔لاہور میں اخباروں کی بہار دیکھ کر اپنی ریاست سے اپنا اخبار نکالنے کی دھن سر پر سوار ہوئی۔ 1921ء میں لاہور چھوڑ کر واپس جموں آ گئے اور اسی سال اپنا اخبار نکالنے اور چھاپہ خانہ لگانے کے لئے درخواست داخل کر دی۔مہاراجہ جو اس کی اجازت دینے کا واحد مختار تھا جو ریاست میں صحافت کا نام تک سننے کا روادار نہیں تھا عرضی ناگوار گزری تو فوراً نامنظور کر دیا۔ملک راج صراف نے ہمت نہیں ہاری اور زائد از تین سال تک اجازت حاصل کرنے کے لئے جدو جہد کرتے رہے۔بالآخر اس کی چوتھی درخواست منظور ہو گئے اور 24 جون 1924ء سے اس کے ہفت روزہ ''رنبیر'' کی اشاعت شروع ہو گئی انہوں نے صداقت کے فروغ کو '' رنبیر'' کا نصب العین بنایا اور اوّلین شمارے میں ہی صداقت کے عنوان سے اپنے اداریے میں لکھا۔

''برادران وطن یہ بات مخفی نہیں کہ عرصہ مدید سے
اجرائے اخبار حدود ریاست کے لئے کس قدر سعی بلیغ ہو رہی تھی اور چند
احباب کی دلی عقیدت کی وجہ سے باوجود ہزار رکاوٹیں حائل ہونے کے

آخر اپنے مقصد میں قوت ارادی و تائید ایزدی سے میدان جیت کر اسم
بامسمّیٰ بن کر قائم و ملک کے شیدائیوں کے حضور اپنے آپ کے ملک کا
خادم تصور کر کے پیش ہوتا ہے۔ اس اخبار کا نام گونگا عامہ میں والئی ملک
سری سرکار والا مدار جی ،مہاراجہ صاحب، بہادر مہاراجہ، رنبیر سنگھ
صاحب ،سرگباشی کی یادگار کو قائم رکھنے کا مقصد ظاہر کرتا ہے مگر یہ
حروف ''رنبیر'' بڑا پرمعنی ہے اس نام کے لغوی معنی بلوان۔ جیتنے والا
بہادر یعنی ضرور جیتنے والا فطرتاً کامیاب ہونے والا غالب آجانے والا
اب یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں انسان دو طرح سے جیت سکتا ہے
ایک آتمک شکتی سے یعنی روحانی طاقت سے دوسرا شاریرک بَل یعنی
جسمانی طاقت سے مگر سب سے زیادہ مظبوط اور ابدی فتح روحانی طاقت
کی فتح ہے جس کے بعد کوئی دیگر طاقت ہرگز نہیں جیت سکتی اب سُنیے
اور ذرا غور کے ساتھ توجہ مبذول کیجئے کہ روحانی طاقت، صداقت یعنی
سچائی پر انحصار رکھتی ہے''۔ ۲؎

یہ وہ زمانہ تھا جب ریاست کی عوام کا شعور اتنا بالیدہ نہیں تھا اور عوام و خواص میں صحافت اور اس کی صداقت کا کوئی مدّاح یا ثنا خواں نہیں تھا۔ عوام میں اخبار پڑھنے کا زیادہ شوق اور غیر جانب داری کو پہچاننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ خبریں فراہم کرنے اور بھیجنے کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا اور ریاست کے اندر صحافیوں اور نامہ نگاروں کی سخت قلّت تھی اس زمانے میں ''رنبیر'' ایک باشعور اور تعمیر پسند صحافت کے معمار کی حیثیت سے اُبھرا اس کی داستان میں ریاست کی جدید اردو صحافت کے ارتقا اور افزائش کی روداد مضمر ہے۔ اس کی سرکردی میں اور اس کو نکالنے کے کئی پہلو تھے اس نے بیرونِ کشمیر اور بالخصوص پڑوسی ریاست پنجاب سے شروع کئے جانے والے بعض کشمیریوں اور ان کے حواریوں کے اخباروں کے قدرے فرقہ پسندانہ رجحانات سے پہلو بچاتے ہوئے ریاست میں ایک مشترکہ وسیع النظر صحافت کی راہ اختیار کی۔ اپنی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ ''رنبیر'' ایک قومی خبار ہوگا کسی

مذہب یا فرقے کی طرفداری نہیں کرے گا بلکہ ریاست کے تمام باشندوں کا بلالحاظ مذہب، ذات یا فرقہ ترجمان ہوگا اس اخبار کی پیشانی پر یہ شعر شائع ہوتا تھا۔

مل جل کے ترانے حبِّ وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں۔

اس نے اپنے نامہ نگاروں کا ایک خاصا اور وسیع نظام قائم کیا۔ ان میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ یہ سری نگر، بارہ مولہ، مظفر آباد، بھدرواہ، ادھم پور، میر پور، رنبیر سنگھ پورہ، بمبر، مانا ور، سانبہ، کھتو، کوٹلی، پونچھ، اور چینی میں مقیم تھے۔ ان میں پنڈت پریم ناتھ بزاز، پنڈت جیالال کول کلم، کاشی نتھ آتمہ، مولوی زین العابدین، چودھری محمد شفیع، منشی غلام رسول خادم خواجہ غلام قادر بندے وغیرہ اور عملے میں ڈوگروں اور کشمیریوں کے علاوہ پنجاب کے افراد بھی شامل تھے ان میں کئی افراد نے بعد میں اپنے اخبار جاری کئے اور اس طرح ریاست کے اندر ''رنبیر'' صحافیوں کے لئے پہلا مدرسہِ صحافت بنا۔ اس اخبار نے فرنگی حکّام کی فرقہ وارانہ حکمتوں کی مخالفت کی اور آزادیِ صحافت اور جرأت اظہار کی ایک اچھی روایت قائم کی۔

جون 1925ء میں جب ریاست کے مالیات اور پولس کے امور انگریز وزیر مسٹر بی۔ جے۔ گلانسی لاہور کے دورے پر گئے تو وہاں مقیم کشمیری مسلمانوں کے ایک وفد نے انہیں اپنی کچھ شکایات پیش کیں۔ مسٹر گلانسی نے ان شکایات میں خصوصی دلچسپی دکھائی اور ریاست کا جواب حاصل کرنے سے قبل ہی وفد کے تئیں اپنی سرپرستی کا اظہار کیا۔

''رنبیر'' نے اس مقصد کو فرقہ وارانہ قرار دیا اور اس پر کڑی نکتہ چینی کی کہا کہ یہ فرقہ وارانہ جذبات کو بڑھکانے کی حکمت ہے کشمیر کے لوگوں کی شکایات مشترکہ ہیں انہیں ہندو یا مسلم کا جامہ نہیں پہنایا جانا چاہئے۔ اس زمانے میں ایک ریاست کے کسی انگریز آفیسر کے خلاف ایسی تنقید ایک بڑی جرات کا اظہار تھی۔ مسٹر گلانسی نے دورے سے واپسی پر ''رنبیر'' کے خلاف سرکاری کاروائی کروائی لیکن ریاست کی کونسل نے اسے بے اثر کردیا۔

اسی طرح جب رنبیر نے 1930ء میں نمک سازی کے قانون کے خلاف مہاتما گاندھی کے ستیہ گرہ کے کئی ریاست کے لوگوں کی حمایتی تحریک کی حوصلہ افزائی کی تو ریاست کے برطانوی چیف سیکریٹری کے حکم سے اس کی اشاعت

روک دی گئی اس پر اس کے سخت جان اڈیٹر نے لاہور کے یکے بعد دیگرے دو ہفت روزہ اخبار ''امر'' اور ''مشیر'' نکالے۔ڈیڑھ سال بعد ریاست کے دیوان (وزیراعظم) کی مداخلت پر ''رنبیر'' کا ڈکلیریشن بحال کر دیا گیا۔اور اڈیٹر نے اسے دوبارہ جموں سے جاری کیا۔1932ء تک سرکار نے کسی اور نئے اخبار کے اجراء کی اجازت نہیں دی یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا کے کئی ممالک میں سیاسی تحریکوں سے بیداری اور تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ ریاست کے کچھ سیاسی طبقے بھی والیِ ریاست کے نظم وضبط کے خلاف تھے چنانچہ نومبر 1933ء میں مہاراجہ ہری سنگھ نے عوام کی شکایت کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمشن قائم کیا جس کے چئرمین اس وقت کے حکومت ہند کے خارجہ اور سیاسی محکمے کے سربراہ بی۔ جے۔ گلانسی تھے اس کمیشن کی سفارشات پر مارچ 1932ء میں جموں اینڈ کشمیر پریس اینڈ پبلیکیشنز ایکٹ نافذ ہوا جس کی رو سے عوام کو پریس اور پلیٹ فارم کی آزادی کا حق حاصل ہوا۔

ریاست کے علمی اور باشعور طبقے ایسی گنجائش چاہتے تھے۔چنانچہ ان کی امید تیز رفتاری سے پوری ہونے لگی۔پھر دیکھتے ہی دیکھتے نئے اخباروں کی ایک صف آراستہ ہوگئی ان میں ''امر'' ''پاسبان'' ''چاند'' ''نوجوان'' ''صداقت'' ''ابرق'' ''ہدایت'' ''اصلاح'' ''جمہور'' ''جاوید'' ''خالد'' ''انکشاف'' ''حقیقت'' ''ڈوگرہ گزٹ'' ''وطن'' ''صادق'' ''اسلام خورشید مجاہد'' اور ''سچ'' شامل تھے۔

اس ایکٹ کے نفاذ کے بعد ریاست میں اردو روزناموں کا دور شروع ہوا جن کے اجرا کا آغاز سری نگر سے ہوا۔ ان میں ''وتستا'' ''مارتنڈ'' ''ہمدرد'' اور ''خدمت'' شامل تھے۔''وتستا'' کا اجرا 1932ء میں ہوا جو وادی کا اوّلین اخبار تھا۔دس ہی سال کے اندر یعنی 1942ء کے آس پاس ریاست کے اخباروں اور رسالوں کی تعداد ایک سو ہوگئی لیکن صحافت کی صورت حال پر حکّام کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور 1940ء تک ریاست میں صحافیوں کے حقوق کی حفاظت کرنے والی کوئی تنظیم بھی نہیں تھی اس مرحلے پر ریاست کی سیاسی جماعتوں کی سرگرمیاں بھی تیز ہو رہی تھیں اور راجواڑہ شاہی کی مخالفت بڑھتی جا رہی تھی چنانچہ حکومت نے ایک بار پھر اخبارات پر پابندیاں لگا دیں۔اب حالت یہ تھی کہ اگر کسی اخبار میں کسی آفیسر کے خلاف کوئی چیز چَھپ جائے تو اس کے اڈیٹر کو بنا مقدمہ چلائے گرفتار کر لیا جاتا تھا اور اسے ہتھکڑی پہنا کر بازاروں میں گھمایا جاتا تھا۔

اسی دوران حکومت نے ایک فہرست تیّار کی جس میں اخباروں کو حکام کی دانست کے مطابق ''الف'' ''ب''

اور’’ج‘‘ کے زمروں میں بانٹا جاتا تھا۔فہرست’’الف‘‘میں وہ اخبارات شامل کیے جاتے تھے جنہیں حکومت اپنے اشتہارات دینا چاہتی تھی۔فہرست ’’ب‘‘ میں حکومت کا اشاعتی مواد پانے والوں کے نام ہوتے تھے اور فہرست’’ج‘‘میں وہ معتوب اخبار تھے جنہیں حکومت کی طرف سے کوئی اشتہار یا اشاعتی موادنہیں دیا جاتا تھا پھران فہرستوں کے اخبارات کوسرکاری آفیسر ہر چھ ماہ کے بعد اپنی من مانی سے ادل بدل کردیتے تھے۔

رنبیر‘‘ نے ان تمام بدعتوں کے خلاف احتجاج منظّم کیا اور صحافت کی عمومی فلاح وترقی کے لئے’’آل جموں اینڈ کشمیر جرنلسٹ ایسوسی ایشن‘‘ کے نام سے صحافیوں کی اوّلین جماعت قائم کی ریاست کے اس وقت کے ماحول میں یہ ایک بڑا تعمیری اور انقلابی قدم تھا اس طرح سے ملک راج صراف کی ایک پہل اور جانفشانی نہ صرف ریاست کی صحافت بلکہ حریت پسند سیاست کی فضا کوساز گار بنایا اور ہندوستان کی تحریک آزادی بھی بہت تیزی سے اپنے مرحلے طے کررہی تھی۔

دوسری عالم گیر جنگ چھڑ گئی تھی جس میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں سے ضروری مشورے کئے بغیر ملک کو جنگ میں جھونک دیا تھا اس فیصلے نے تحریک آزادی کو نئی اہمیت اور نئی حرارت دے دی ہندوستان کے اخباروں نے بالخصوص اردو کے اخباروں نے برطانوی راج کی کوتاہ اندیشی کی مذمّت کی۔قومی تحریکِ آزادی کئی دیسی ریاستوں میں سرائیت کر چکی تھی لیکن ریاستی تحریک بھی (ریاستوں کی اپنی تنظیم آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس) کے تحت چل رہی تھی۔ یہ تنظیم ریاستوں کے حکمرانوں کے متعلق اپنی آواز بلند کرتی تھی۔کشمیر میں یہ رجحانات خاصے شدید تھے جن پر رنبیر رائے زنی کرتا رہتا تھا۔

امرت بازار پتریکا۔

ہندوستان میں تحریک آزادی کے رہنماوں نے 1942ء میں انگریزوں سے ہندوستان چھوڑ دوتحریک شروع کی اس تحریک کے بانی انڈین نیشنل کانگریس کے تقریباً تمام چوٹی کے لیڈروں کونظر بند کر دیا گیا۔ملک کے دیسی اخباروں نے اورزیادہ شدّت اور بہادری سے برطانوی راج کی سازشوں کو بےنقاب کیا اس موقع پر آل جموں اینڈ کشمیر جرنلسٹس ایسوسی ایشن کے زیراہتمام اگست 1943ء میں سری نگر میں اوّلین ریاست گیر کانفرنس منعقد کی گئی

جس میں ہندوستان کے سرکردہ صحافیوں کو بھی مدعو کیا گیااس کے افتتاح کے لئے انگریزی روزنامہ ''امرت بازار پتریکا'' کے ایڈیٹر تشار کانتی گھوش کا انتخاب کیا گیا یہ انتخاب محض ایک تقریبی ضابطہ ہی نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے کشمیراور امرت بازار پتریکا کی زائد از نصف صدی کی ولولہ انگیز تاریخ تھی جس میں ریاست جموں وکشمیر کو برطانوی سازشوں سے بچانے کی ایک پُر اثر داستان تھی۔ انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے اواخر میں کلکتہ کے اس اخبار نے اپنے عقابی ذرائع اور بے خطر حوصلے سے کشمیر کو اس کے حکمران سے چھیننے کی سازش کو منظرعام پر لایا جس پر برطانوی حکومت نے پریشان ہوکر سخت گیر official secrets Act نافذ کر دیا جس کی مدد سے اخباروں کی زبان بند کر دی تھی اس زمانے میں ہندوستان کے متعدد اخبار دیسی ریاستوں کے معاملوں میں دلچسپی لیتے تھے اس دور میں کلکتہ کے ''امرت بازار پتریکا'' کو خصوصی امتیاز حاصل تھا جو کشمیر کے واقعات پر خصوصی خبریں چھاپتا تھا۔

ان دنوں کی بات ہے جب برطانوی حکومت کشمیر پر روسی حملے کے خدشے سے خائف تھی اور اسے یہ بھی شک تھا کہ مہاراجہ کشمیر کے روس سے خفیہ تعلقات ہیں اس شک اور خوف کے تحت اس نے مہاراجہ کے اختیارات کے استعمال میں کئی رکاوٹیں پیدا کر دیں تھیں۔ 1880ء میں مہاراجہ کشمیر وائسرائے سے ملنے کے لئے کلکتہ گئے جہاں وائسرائے کی ایما پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ کشمیر میں ایک برطانوی نمائندہ مقرّر کیا جائے اور انگریزی تاجروں کو ریاست میں زمین خریدنے کی اجازت دی جائے۔

اسی زمانے میں علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ (علی گڑھ) کی ایک خبر میں بتایا گیا کہ لندن کے رائل کالونیل انسٹیٹیوٹ میں سر سیپل گرفن نے ایک تقریر میں انگریزوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان جا کر وہاں کے پہاڑی اضلاع میں آباد ہوں انہوں نے کہا کہ برطانیہ ہندوستانی سلطنت کی حفاظت کے لیے تیس لاکھ ایسے انگریز آباد کاروں کو کشمیر میں سکونت اختیار کرنی چاہیئے جو فوجی فرائض انجام دے سکیں۔ بنگال کی عوام اور دیسی راجا برطانوی حکّام کے سلوک سے بالکل نالاں تھے۔ الہ باد کا ''پائنیر'' ان کی تحریروں پر بہت غضب ناک رہتا تھا اس نے لکھا کہ یہ اخبار برطانوی حکومت کے خلاف لوگوں کو بھڑکا رہے ہیں ان اخباروں نے جن میں ''امرت بازار پتریکا'' نمایاں تھا، اس نے لکھا کہ ریاستوں کی جانب برطانوی حکام کے ارادے شرانگیز ہیں اور ایسا ہی ہوا۔ برطانوی حکومت نے مہاراجہ کشمیر پر یہ الزام لگایا کہ وہ برطانوی نمائندہ مسٹر پلاوڈن کو زہر دے کر مارنا چاہتے تھے اور روسی حکومت کے

ساتھ خط وکتابت کر رہے ہیں۔

''امرت بازار پتریکا'' نے کشمیر کے بارے میں وائسرائے لارڈ ڈفرن کے نائب مسٹر مارٹیمر ڈیورینڈ کی خفیہ سازشیں بھی شائع کیں اور اپنی رپورٹ میں کہا کہ برتانوی حکومت اپنی اپنی سیاسی اغراض کے لئے مہاراجہ پر الزامات لگا رہی تھی اور روسی خطرے کو سامنے لا رہی تھی۔ برطانوی حکومت نے نہ صرف مہاراجہ پر روس سے ساز باز کا الزام لگایا بلکہ اسے احمق بے عقل اور ریاست کا کام کاج سنبھالنے کے نااہل قرار دیا اور وہاں اپنا منتخبہ دیوان مقرّ رکر دیا۔ مہاراجہ پر الزام لگایا کہ اس کے رشتہ دار اس سے خوش نہیں ہیں برطانوی حکّام نے کہا کہ مہاراجہ از خود بے دخلی چاہتے ہیں لہذا وہاں ایک کونسل آف ریجنسی قائم کر دی گئی جسے برطانوی ریزیڈنٹ کی منظوری کے بغیر کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار نہ دیا گیا۔ ''امرت بازار پتریکا'' نے بے دخلی کے بارے میں مہاراجہ کا وہ مبیّنہ مراسلہ بھی شائع کیا جو اس کی اطلاع کے مطابق برٹش ریزیڈنٹ کرنل نسبت کے دباؤ میں لکھا گیا تھا اور کرنل نسبت نے اس کام کے لئے ریاست کا ایک برطرف دیوان لچھمن داس کو استعمال کیا۔

کشمیر کے واقع سے قبل لارڈ فرن نے سامراجی ضرورتوں کے لئے برما کو برطانوی سلطنت میں ملا لیا تھا۔ برطانوی حکومت کی یہ پالیسی اس کی ریاستوں کے حکمرانوں سے وعدوں اور معاہدوں کے برعکس تھی لیکن یہ حکومت اپنے معاہدوں کی اس وقت تک پابند رہتی تھی جب تک اس کے مفادات اس کی اجازت دیتے تھے۔ ''امرت بازار پتریکا'' نے لکھا

> ''ہم پختگی سے سمجھتے ہیں اور واضح طور پر کہتے ہیں کہ کوئی طاقت کشمیر حاصل کرنا چاہتی ہے یہ کسی ایک فرد ایک اخبار کا خیال نہیں بلکہ ہماری رائے میں پورے ہندوستان کا خیال ہے۔ ''امرت بازار پتریکا '' میں خفیہ سرکاری پالیسی کی اشاعت نے تہلکا مچا دیا جیسا کہ بتایا گیا ان اشاعتوں سے پریشان ہو کر برطانوی حکومت نے 1889ء میں official secrets Act نافذ کیا اور برطانوی حکومت نے اپنے

جاسوس بھی مقرر کئے جو ریاستوں کے اخبارات کی کیفیت بتاتے تھے۔
''امرت بازار پتر یکا'' نے یہ بھی لکھا کہ حکومت برطانیہ اپنے نظام کے بارے میں عدل وانصاف کا دعویٰ کرتی ہے لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ یہاں ملزم، منصف، گواہ، وکیل سب ایک ہی تھیلے کے چٹ پٹے ہیں۔ ادھر برطانوی راج کی بدسلوکی سے بیزار ہو کر مہاراجہ کشمیر نے وائسرائے کو ایک فریادی خط بھی لکھا جو کچھ اس طرح سے تھا اگر آپ میری آزادی بحال نہیں کرنا چاہتے ہیں تو آپ مجھے اپنے ہاں بلا کر اپنے ہاتھ سے میرے سینے میں گولی داغ دیں تا کہ یہ بدنصیب راجہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی نا قابلِ برداشت اذیّت اور عزلت سے نجات پائے۔ یہ خبر شمال مغربی صوبہ جات متحدہ (موجودہ اتر پردیش) کے دو اخباروں ''نجم الاخبار'' 12 جون 1989ء اور ''ہندوستان'' 13 جون 1989ء میں نمایاں طور پر چھپی۔ ؂۳

ان حقائق سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کے بارے میں انگریزی حکومت کی نیّت پہلے سے ہی صاف نہیں تھی اور ریاست کے اردو صحافی ملک راج صراف اس سے واقف تھے۔ چنانچہ دیگر زاویوں کے علاوہ تشار کانت گھوش کو کانفرنس کے افتتاح کا اعزاز دینے اور ایسوسی ایشن کا فیصلہ کرنا ایک موقع ملا جس کا وہ شکر گزار بھی تھا۔ تشار کانتی گھوش نے اپنے افتتاحی خطبے میں اپنے بزرگوں کی متذکرہ تحریروں کے حوالے سے کہا کہ وہ کشمیر کے صحافیوں سے شخصی رابطہ قائم کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں اور ان کے ذہن میں کشمیر سے اپنے اخبار کے قدیم تعلقات کی بنیادیں موجزن ہیں۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے بھی ''امرت بازار پتر یکا کی خدمات کو ایک تاریخی خراج عقیدت پیش کیا جس کا علم ملک راج صراف کی سوانح حیات سے ہوتا ہے۔

ریاست کی پہلی پریس کانفرنس۔

1947ء میں ریاست کے الحاق کے نازک موڑ پر ہری سنگھ نے جن کا۔ پاکستان سے سابقہ تعلقات کو قطعی

فیصلہ ہونے تک جوں کا توں رکھنے کا معاہدہ۔ Agreement still Stand ہو چکا تھا۔''امرت بازار پتریکا'' کے ہی ایک نمائندے سے ایک انٹرویو میں اپنے دِل کی بات کہی اور بتایا کہ اگر انہیں پاکستان سے الحاق کے میثاق پر دستخط کرنا پڑے تو یہ رسم صرف ان کے خون سے ہی ادا ہو سکتی ہے۔

تشار کانتی گھوش کا افتتاحی خطبے میں صحافت اور اس کی عظمت ریاست کے کردار کی نشان دہی کی گئی لیکن ساتھ ہی ملک راج صراف کا خطبہ بھی جنہوں نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی ایک اہم اور دور رس دستاویز تھی ان کے خیالات سے ریاست کے ایک صحافی کی زبان سے صحافت اُجاگر ہوئی انہوں نے ایک تاریخی نظر سے برطانوی بالا دستوں کی ڈپلومیسی کے باوجود قدیم کشمیر اور قدیم ہندوستان کے سیاسی اور ثقافتی رشتوں کی عکاسی کرتے ہوئے ریاست کے عصری اور صحافتی پسِ منظر پر ایک تبصرہ پیش کیا جو آج بھی بامعنی اور باوزن ہے۔ریاستی صحافت کی ابھرتی ہوئی قوت کے امکانات پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

ایک اخبار کیا چیز ہے۔؟

اور پھر خود ہی جواب دیا۔'' یہ عوام کی آواز کی بازگشت ہے۔ یہ صدائے صداقت اور آوازِ الٰہی ہے'' انہوں نے کہا پریس بہت بڑی طاقت ہے لیکن اس کے زور کا انحصار صحافی کے ہاتھوں کے استعمال پر ہے وہ اس سے تعمیر کا کام بھی لے سکتا ہے اور تخریب کا بھی صحافی کی یہ طاقت وصلاحیت کسی سرمائے دار حکومت کی طرف سے عطا نہیں ہوتی بلکہ اس میں لوگوں کے اعتماد سے پیدا ہوتی ہے اور انہیں کی امانت ہوتی ہے۔صحافی کا یہ اخلاقی اور مقدّس فرض ہے کہ وہ اسے دیانت داری سے اپنے قلم کو استعمال کرے۔اسے فرقہ وارانہ مصلحت سے دوچار نہیں ہونا چاہیے نہ ہی کسی اور ترغیب کے تحت عوام کی طرف اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں اپنے قلم کو کمزور کرنا چاہیے اسے ظلم بے انصافی ظلم کے شکار لوگوں، پسماندہ طبقوں، محنت کش کسانوں اور کمزور لوگوں کے تحفظ کے لئے بغیر کسی خوف، رعایت یا تعصب کے اپنے اخبار کی طاقت کو بروئے کار لانا چاہیئے۔

انہوں نے پوچھا ہمارے عوام ناخواندگی، جہالت اور بھوک کے حلقوں میں گھرے ہوتے ہیں کیا یہ ہمارا لازمی فرض نہیں کہ ان کی مصیبتوں اور دشواریوں کی نیابت کریں اور انہیں ان سے نجات دلانے کے لئے اپنی بہترین صلاحیتوں سے کام لیں۔

اخباری اطلاع کے مطابق اس کانفرنس میں قریب آٹھ ہزار لوگ شریک ہوئے ان میں ممتاز صحافی، ممتاز شہری، میونسپل کمشنر، اسمبلی کے ممبر قانون دان، پروفیسر، ڈاکٹر، تاجر اور عوامی لیڈر شامل تھے۔ کانفرنس کے اسٹیج پر دیگر اکابر کے علاوہ نیشنل کانفرنس کے صدر شیخ محمد عبداللہ اور بار ایسوسی ایشن کے صدر پنڈت جیالال کلم بھی موجود تھے۔

کانفرنس کی کاروائی میں ریاست کے ساٹھ اور پڑوسی پنجاب کے نصف درجن صحافیوں نے حصہ لیا۔ اس کانفرنس نے ریاست کے صحافتی منظر کو بدل دیا اور برطانوی نقاب میں رہنے والی پریس اور بالخصوص اردو پریس ہندوستان کی ہمہ گیر انقلابی تحریک کا نیا محاذ بن گیا۔ کانفرنس کی تقریریوں نے ملک بھر کے سرکردہ اخباروں کی توجہ حاصل کی خود ریاست کی صحافت کو ایک نیا حوصلہ مل گیا اس زمانے میں یہ ایک بہت بڑی بات تھی ایک راجواڑہ شاہی کے اردو پریس کا ملک کی فیصلہ کن انقلابی تحریک کے ہراوّل دستے میں شامل ہونا گویا ایک تاریخی سیاسی کامرانی بھی تھی اس کے فوراً بعد ریاست کے نئے آنے والے وزیر اعظم کو یہ خیال اور احساس ہوا کہ انہیں کبھی کبھی اپنے اخباروں کے ایڈیٹروں سے مل کر پریس کانفرنس کرنی چاہیئے اس وقت تک ریاست میں ایک سرگرم اور فعال پریس تیّار ہو چکا تھا جو تقریباً سب کا سب اردو میں تھا۔ اخباروں کے نام جن کے نمائندوں کو وزیر اعظم کی پریس کانفرنس میں مدعو کیا گیا۔ ملک راج صراف کی متذکرہ سوانح حیات میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں جنہیں یہاں ایک فہرست کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اخبار ۔	اڈیٹر/نمائندہ
رنبیر	ملک راج صراف
خدمت	خواجہ غلام رسول عارف
مارتنڈ	پنڈت پریم ناتھ کاہسنا
ہمدرد	پنڈت پریم ناتھ بزاز
رہبر	پنڈت دینا ناتھ مست کاشمیری
دیش	کشیپ بندھو
خالد	خواجہ صدرالدین مجاہد

سچ	ماسٹر روشن لال
پاسبان	منشی معراج الدین احمد
چاند	دیوان نرسنگھ داس نرگس
شمشیر	رگھبیر سنگھ مکٹ
پکار	بلراج پوری
وکیل	پنڈت شمبھو ناتھ کول ناظر
خالصہ گزٹ	سردار گرو پرب سنگھ
سدرشن	پنڈت وشوا ناتھ کیرنی
لیش سیوک	کوی راج ویشنو گپت
کسان	یٰسین مسکین
وطن	سردار مہندر سنگھ۔
آنند	گردھاری لال آنند
رتن	اوم پرکاش صراف
اوشا	شری متی شکنتلا سیٹھ
جاوید	کے ایچ خورشید
الانسان	چودھری محمد دین
بھارتی	بھاگ مل
زندگی	رام سرن داس ملہوترا
گلاب	دینو بھائے پنت
سچ	میر پور۔راجہ محمد اکبر خان
صداقت	میر پور دھرم ویر

پر بھات   پونچھ۔خواجہ غلام قادر باندے

ریاست کی اوّلین پریس کانفرنس 13 فروری 1944ء کو ہوئی جسے ریاست کے دیوان سر بی این راو نے اپنا عہدہ سنبھالنے کے تین ہی دن بعد اپنی خواہش پر خطاب کیا۔اب ریاست کی سیاسی زندگی باقی ہندوستان کی سیاسی زندگی کی ہم پلہ ہوگئی۔اس میں اردو صحافت کی پہل کاری نے اسے وقت کے نقشے پر منوّر کردیا۔

مئی 1944ء میں ریاست کی سرکردہ سیاسی جماعت آل جموں اینڈ کشمیر نیشنل کانفرنس نے راجواڑہ شاہی کے خلاف ''کشمیر چھوڑ دو'' Kashmir Quit کی تحریک شروع کردی یہ ہندوستان کی کچھ عرصہ قبل شروع ہونے والی Quit India کی انقلابی تحریک کے مماثل تھی جو ہندوستان اور ریاست کشمیر کی قومی تحریکوں کے مقصد کی یکسانیت کا تاریخی ثبوت تھی ۔ یہاں بھی ریاست کے ممتاز ترین لیڈر اور نیشنل کانفرنس کے صدر شیخ عبداللہ اوران کے قریبی رفقا کو فوراً گرفتار کرلیا گیا اب ''رنبیر'' کے ساتھ اخباروں کا ایک قافلہ تیار ہو گیا تھا یہ سب مطلق العنانی اور تانہ شاہی کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔

پھر جب پنڈت جواہر لال نہرو شیخ محمد عبداللہ کی حمایت کے لئے سری نگر آئے اور ریاستی حکومت نے ان کے داخلے کو روکنے کی ناکام کوشش کی تو ان تمام اخباروں نے ریاستی حکّام کے اقدام کی مذمّت اور پنڈت نہرو کی مجاہدانہ رفاقت کی ستائش کی۔

رنبیر''میں مہاراجہ نوازی کے رجحانات تھے۔اس نے مہاراجہ کے کئی اقدامات کی تعریف کی لیکن یہ ان کی غیر جمہوری تدبیروں اور زیادتیوں کی مذمّت سے کبھی نہ چوکا۔اس نے ریاست میں ایک جمہوری حکومت اور ریاست کے ہندوستان سے الحاق کی مسلسل وکالت کی اس نے مہاراجہ کی اس وقت سخت مذمّت کی جب وہ اپنے دیوان پنڈت رام چندر کاک کی مشاورت میں کشمیر کو آزاد اور کچھ پہاڑی علاقوں کو ساتھ ملا کر ایک وسیع تر ریاست بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ریاست کا دیوان اس کی تنقیدی تحریروں سے بہت برہم ہوا اور جون 1947ء میں کوئی وجہ بتائے بغیر اس کی اشاعت روک دی گئی۔15 اگست 1947ء کو آزادی ملنے کے فوراً بعد 26 اگست 1947ء کو اس کی اشاعت بحال کرنے کے حکم جاری ہو گیا اور دس ستمبر 1947ء سے یہ پھر شائع ہونے لگا۔

سیاسی قافلے کی رفتار سے تیز تر ہو رہی تھی پندرہ اگست 1947ء کے بعد اس کا رہبر ہندوستان کا قانون

آزادی تھاجسے اس کے نفاذ کے ساتھ وجود میں آنے والے دونوں نئے ملک ہندوستان اور پاکستان اوران میں شامل سابق ریاستوں کے حکمران تسلیم کر چکے تھے لیکن کچھ ریاستوں کے حکمران اپنی من مانی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

شخصی سلطنت اور شہنشاہیت کے خلاف عوامی اور صحافتی لہر کے اس دوَر میں کوئی مہاراجہ یا حاکم اپنی ضد سے کام نہیں لے سکتا تھا26 اکتوبر 1947ء کو ریاست کے سربراہ مہاراجہ ہری سنگھ نے انڈین یونین سے غیر مشروط الحاق کرنے کی اطلاع دی اور چند ہی دن بعد نیشنل کانفرنس کے صدر محمد عبداللہ کی سربراہی میں ریاست میں ایک ایمرجنسی ایڈمینیسٹریشن قائم کر دیا گیاجسے مارچ 1948ء میں باضابطہ بنادیا گیا۔یہ ''رنبیر'' اور ریاست کے دوسرے اخبارات کے مطالبوں کی تعمیل تھی۔

''رنبیر'' نے عوامی ذمہ دار حکومت کے کام کی پر جوش حمایت کی لیکن اس کے کچھ ایسے اقدامات پر نکتہ چینی کی جواس کی دانست میں نامناسب اور نیشنل کانفرنس کی علانیہ پالسی سے بے میل تھے چنانچہ ان دونوں میں اختلاف پیدا ہوگیا۔''رنبیر'' نے اسے ہوا دینے کے بجائے اپنی اشاعت ہی بند کر دینا بہتر سمجھا۔اس وقت ''رنبیر'' کی مالی حالت اطمینان بخش تھی اس کی قیمت فی پرچہ ڈیڑھ آنہ تھی اوراس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کے پریس سے نکلتے ہی صرف جموں میں ہی اس کے ایک ہزار پرچے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے رنبیر کے آخری شمارے کے اداریے میں اڈیٹر ملک راج صراف نے لکھا۔

> ''بڑے دکھ بھرے دل کے ساتھ یہ علان کیا جاتا ہے کہ چند در چند وجوہات سے جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں'' رنبیر'' کی مزید اشاعت کو جاری نہیں رکھا جا سکتا اس لئے میں اسے غیر معین عرصے کے لئے بند کر دینے پر مجبور ہوں۔۔۔۔۔۔''رنبیر'' کی اس رضا کارانہ بندش کا یہ مطلب ہرگز نہیں جس قوم کی پرواہ اور ترقی پسندانہ مقاصد کو لے کر''رنبیر'' معارضِ وجود میں آیا تھا اور جن کے حصول کے لئے وہ اب تک برابر کوشاں رہا ہے اور جس میں اسے کسی حد تک

کامیابی بھی نصیب ہوئی ہے اس میں کوئی کمی آجائے گی یہ مقاصد تو مجھے
جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں اور مستقبل میں میری اور میرے خاندان
کی آئندہ پبلک زندگی کے لائحہ عمل کا بدستور ایک اہم جز بنے رہیں
گے۔'' ۴۲

رنبیر کے بعد ملک راج صراف کی سرگرمیاں۔

چنانچہ رنبیر تو بند ہو گیا لیکن اس کے فعال مدیر کی صحافتی سرگرمیاں جاری رہیں۔ وہ اب ہندوستان کے مختلف انگریزی اخباروں اور خبر رساں اداروں کی نامہ نگار ہو گئے۔ نامہ نگاری بھی ان کی صلاحیتوں کا ایک نہایت ہی روشن حصہ تھی اور کئی ملکی اور غیر ملکی اخباران کی اس صلاحیت سے بہرہ ور ہوئے۔ 1979ء میں اپنی عمر کے 86 سال میں ملک راج صراف نے ہندوستانی صحافی کی حیثیت سے پاکستان کا ایک شخصی خیر سگالی کا دورہ کیا وہاں بیسوں اکابر اور صحافیوں نے ان کا استقبال کیا اس دورے کے تاثرات پر انہوں نے اردو میں دو کتابیں بہ عنوان۔''میری پاکستان یاترا'' اور ''انسانیت ابھی زندہ ہے'' شائع کیں جن میں یہ نظریہ پیش کیا کہ مستقبل میں پاکستان اور ہندوستان کے باہم امن وامان سے رہنے کے امکانات خاصے قوی ہیں۔

86 سال کی عمر میں ان کی قوّتِ عمل اور صحافتی سرگرمیاں دیکھ کر پاکستان کے صحافی اور مدیر بہت متاثر ہوئے ان کو استقبالیہ مجلسوں اور اپنے اخباروں میں خراج تحسین ادا کرنے والوں میں منشی معراج الدین اڈیٹر پاسبان سیالکوٹ، عبدالحمید نظامی (اڈیٹر دور جدید سیالکوٹ) کلیم اختر، جرنلسٹ لاہور، اڈیٹر امروز لاہور، اڈیٹر آفاق لاہور، اڈیٹر چٹان لاہور، پروفیسر محمد اسحاق چیف اڈیٹر صداقت لاہور، گلزار احمد فدا اڈیٹر جہاد سیالکوٹ، سرشاد اختر ملک چیف رپوٹر امروز لاہور، اڈیٹر مشرق پشاور لاہور کراچی کوئٹہ، اڈیٹر ڈیلی بزنس رپورٹ فیصل آباد شامل تھے۔

ان جواں ہمت بزرگ نے 95 سال کی عمر میں 21 فروری 1989ء کو وفات پائی۔ وہ مرتے وقت تک فعال تھے اور ایک سال انتقال سے پہلے شہرہ آفاق انگریزی روزنامہ ہندو مدراس کے نامہ نگار تھے۔ انہوں نے کل ملا کر 75 سال تک صحافت کی آبیاری کی وہ اپنی ریاست کے بابائے صحافت ہی نہیں بلکہ ان کی تاریخ ساز

انقلابی تبدیلیوں کے قومی شہرت کے معمار بھی تھے۔انہوں نے اپنے پانچوں بیٹوں کو بھی اردو صحافت کی تربیت دی اور وہ ''رنبیر یا رتن سے وابستہ رہے لیکن ان دونوں جریدوں کی مسدودی کے بعد وہ انگریزی صحافت کی طرف مائل ہو گئے۔''رنبیر'' نے کل چھبیس سال کی عمر پائی اس میں سے تقریباً 19 برس ہفت روزہ اور آخری سال تقریباً سہ روزہ اور روزنامہ خدمات انجام دیں۔

یہ وہ اخبار تھا جس میں جدید کشمیر کی سیاسی تاریخ اور اس کے عہد ساز الحاق کے بارے میں آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی اور دل و جان پر جھیلی داستان رقم ہوئی۔اس کا ریکارڈ اس کے بانی کی آرزو کے مطابق جموں یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے متحدہ ہندوستان کی ریاست جموں وکشمیر میں یہ ایک ہمہ صفت اخبار تھا گو کہ یہ ایک سیاسی جریدہ تھا لیکن اس کے ادبی کالم کی کشش بھی کچھ کم نہ تھی ممتاز شعرا اس میں اپنا کلام بغرضِ اشاعت بھیجتے تھے ان میں جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، سیماب اکبری، ساحر لدھیانوی، مولانا ظفر علی خان، پروفیسر محمد دین تاثیر آغا حشر اور مجید لاہوری، وغیرہ شامل تھے۔برّصغیر کی تقسیم، کے بعد بھی اس کی سیاسی حیثیت مسلم رہی اور اپنے آخری شمارے تک بڑی آب وتاب سے سیاسی، سماجی، ابدی اور معاشرتی خدمات انجام دیتا رہا۔

رتن۔

دسمبر 1934 کو ''رنبیر'' کے ادارے سے ہی ریاست میں بچوں کا اوّلن رسالہ ماہنامہ ''رتن'' جاری ہوا۔ ریاست میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ تھا جو طلبہ کے لئے وقف کیا گیا تھا اس کے قلمی معاون میں ریاست کے ممتاز ادیب شامل تھے جن میں پریم ناتھ پردیسی پیش پیش تھے۔

انہیں ادیبوں کا ایک ممتاز گروپ بعد میں ریاست کے ممتاز روزناموں ''ہمدرد'' اور ''خدمت'' سے وابستہ ہوا۔اکتوبر 1947 ء میں جب قبائلی دراندازوں نے کشمیر پر حملہ کیا تو نیشنل کانفرنس کے لیڈر خواجہ غلام محمد صادق اور مولانا محمد سعید مسعودی کی رہنمائی میں ایک کلچرل فرنٹ قائم ہوا جس میں یہ ادیب پیش پیش تھے ان میں صلاح الدین احمد، پریمناتھ پردیسی، قیصر قلندر اور پران کشور شامل تھے۔

''رتن'' نے ہندوستان گیر وسعت اور شہرت پائی۔سرکاری ریکارڈ کے مطابق دسمبر 1945 ء میں اس کی

تعداد اشاعت 25 ہزار تھی پریس اینڈ پبلیکیشنز ایکٹ کے نفاذ کے بعد صحافیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد سامنے آئی کچھ تو ''رنبیر'' کی مثال سے متاثر تھے اور کچھ فطری صلاحیتوں اور اپنی امنگوں سے لبریز تھے۔نو واردوں میں مختلف جماعتیں بھی شامل تھیں جنہوں نے اپنے اپنے اخبار نکالے اور ریاست کا بازارِ صحافت ہرے بھرے گلستان کا منظر پیش کرتا رہا۔

صداقت۔

مولانا محمد سعید مسعودی نے 1933ء میں مولوی غلام مصطفیٰ پیر حسام الدین اور ایس کیو۔قلندر کی ادارت میں ہفت روزہ صداقت نکالا اس کی پالیسی مہاراجہ سرکار کو نا گوار گزری اور اس کی اشاعت بحکم گورنر کشمیر بند کردی گئی اس کے بعد سری نگر ہی سے ایس کیو قلندر ہی کی ادارت میں ہفتہ وار حقیقت جاری ہوا۔''حقیقت'' بھی سرکاری عتاب کا شکار ہوا شیخ محمد عبداللہ نے اپنی سوانح حیات ''آتش چنار'' میں لکھا ہے کہ ''صداقت'' اور ''حقیقت'' دونوں ان کی جماعت آل جموں اینڈ کشمیر مسلم کانفرنس کے زیر اہتمام نکالے گئے۔

''البرق''۔

میدان صحافت کے سرگرم رکن جو بعد میں ریڈیو کشمیر میں ملازم ہو گئے ایس کیو قلندر نے ''حقیقت'' کی مسدودی کے بعد ''جہاں گیر اور ایم اے صابر نے ''البرق'' نکالا جو کہ بعد میں دینا ناتھ مست نے خرید لیا۔

''رہبر''

محی الدین نے اسی دور میں ''رہبر'' نکالا نیشنل کانفرنس کے قیام کے بعد اس کے پیش رو مسلم کانفرنس کے زیر اہتمام مولوی محمد یوسف شاہ نے ''ملت'' نکالا۔

''خدمت''

یہ اخبار 1939ء میں اس وقت وجود میں آیا جب مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدل دیا گیا تھا۔''خدمت''

کی ابتدا کے بارے میں شیخ عبداللہ نے لکھا ہے کہ (یہ مسلم کانفرنس کی تبدیلی سے قائم ہونے والی) نیشنل کانفرنس کی تدبیر تھی اوراس کے پہلے مدیر مولانا محمد سعید مسعودی تھے۔ ریاست جموں وکشمیر کی صحافتی تاریخ باقی ملک کی تاریخِ صحافت سے قدرے منفرد ہے اوراس کے دو خاص پہلو ہیں۔

۱ ۔لسانی پہلو ہے

۲ ۔اخباروں کی عمر کے متعلق ہے۔

لسانی پہلو: بقول محمد یوسف ٹینگ ''19 ویں صدی کی آخری دہائی میں جب مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے فارسی کی جگہ اردو کو ریاست کی سرکاری زبان بنائی تو جہاں جموں نواسیوں نے اس کا استقبال کیا وہاں کشمیر کے اس وقت کے عمائدین نے میر واعظ کشمیر کی سرکردگی میں اس تبدیلی کے خلاف تحریرپُر احتجاج کیا۔اس وقت نئے تقاضوں کی تازہ ہوائیں گنگ وجمن کے میدانوں سے اٹھ کر شوالِک کے سارے علاقے کو بھی مہکا رہی تھی۔ کشمیر کی برفانی چوٹیوں کی آڑ لے کر بڑی بی فارسی اپنی اخری آرام گاہ سے اکھاڑنے کے خوف میں مبتلا ہو کر ہانپ رہی تھی لیکن اس وقت اردو اپنے نئے نظام کے ساتھ رتھ پر سوار تھی اور چھڑ ھتے سورج کو کونسی پھونک بجھا سکتی ہے؟ اہل کشمیر اردو کی اس یورش کو ایک تمدنی یلغار خیال کر رہے تھے اور ان کا احساس کچھ یوں تھا کہ میدانوں کے اردو جاننے والے پیر پنجال کو پار کر کے ان کی ذہنی اور انتظامی دنیا پر چھا جائیں گے بہر حال آج زمانے کی عجیب منطق نے میزیں پلٹ دیں ہیں۔؂۵

دوسرا پہلو اخباروں کی عمر۔

یہاں ایسے اخبار کم ہی ملتے ہیں جنھوں نے لمبی عمر پائی ہو۔1950ء تک کے زمانے تک ''رنبیر'' ''امر''

ماتنڈ'' اور'' خدمت'' استثنا کی مثالیں ہیں۔ ملک راج صراف کے خلیفۂ اکبراوم پرکاش صراف کا کہنا ہے کہ یکم اکتوبر 1947ء کوجیل کی رہائی کے بعد جب شیخ محمد عبداللہ نے اپنے اوّلین بیان میں ہی یہ اعلان کیا کہ وہ اپنے خون کے آخری قطرے تک دوقومی نظریے یا مذہب کی بنیاد پر ریاستوں کے قیام پر ایمان نہیں لائیں گے تو ریاست کے کسی اخبار نے انکے بیان کی مزمّت یا مخالفت نہیں کی کشمیر کے صحافی یوسف جمیل نے لکھا ہے۔

'' مشکلات کے باوجود 1932ء تا 1947ء کشمیر میں صحافت کا معیار مجموعی طور پر اچھا رہا۔ اس دور میں جتنے بھی صحافی منظر عام پر آئے ان میں اکثر کی سیاسی وابستگیاں تھیں۔ اس طائفے میں پنڈت پریم ناتھ بزاز، مولانا محمد سعید مسعودی اور پنڈت کیشپ بندھو شامل تھے 1947ء سے کچھ پہلے اور اس کے بعد ان میں سے بیشتر نے صحافت کو خیر آباد کہہ دیا تھا اور عملی سیاست میں حصہ لینے لگے جس سے ریاست کی صحافتی دنیاں میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا۔

جب 1947ء میں کشمیر پر قبائلی حملے ہونے شروع ہو گئے تو مہاراجہ اس وقت الحاق کے بارے میں تذبذب میں تھا اور ریاست کی خودمختاری کا خواب دیکھ رہا تھا لیکن حملوں نے یہ موقع نہ دیا اور کشمیر کو تباہی سے بچانے کی خاطر ہندوستان سے شرائط کی بنیاد پر الحاق کیا اور آزادی کا خیال فی الحال ترک کیا آزادی ہند سے قبل جموں وکشمیر کی ریاست پانچ واضح ثقافتی حصوں میں تھی۔ ان میں گلگت، بالتستان، ہنزا پر پاکستان نے قبضہ کر دیا جو جکہ آج بھی جاری ہے۔ اور اس کے بعد جموں وکشمیر میں تین خطے رہ گئے۔ جموں، کشمیر، اور لدّاخ، الحاق کے نتیجے میں راجواڑہ شاہی ختم ہو گئے۔ عوامی جماعت آل جموں اینڈ کشمیر نیشنل کانفرنس مہاراجہ کی حکومت برسر اقتدار میں آ گئی۔ ڈوگرہ راج کے بجائے عوامی راج وجود میں آ گیا۔

1947ء کے بعد اردو صحافت۔

ریاست میں 1947 میں تمام واقعات نے حالات کو بہت مقدر کر دیا تھا جس سے ریاست کی صحافت خاص طور پر متاثر ہوئی۔ آزادی سے عین قبل ملک کے کئی حصّوں میں اور بالخصوص پڑوسی پنجاب میں فسادات اور بگڑتے ہوئے حالات نے جگہ جگہ رخنے اور خطرے پیدا کر دئے تھے۔ روزمرّہ کی زندگی درہم برہم ہو گئی تھی۔ مواصلات

کے سلسلے ٹوٹ گئے تھے۔ ریاست میں اخباروں کی طباعت کے لیے لاہور سے آنے والی اشیا اور بالخصوص روشنائی کی آمد بند ہوگئی ان دشواریوں سے پیدا ہونے والی رکاوٹوں پر عینی شہادت کا ایک بیان ملک راج صراف کا ملتا ہے جو ماہنامہ ''رتن'' کے مہتمم بھی تھے۔ اس رسالے کی سرکاری طور پر تصدیق شدہ سرکولیشن 25 ہزار تھی۔ اس کی اقتصادی حالت اچھی تھی جناب صراف صاحب نے لکھا کہ '' رسالے کے کچھ آرٹسٹ اور خوش نویس لاہور سے اس کا کام کر کے جوں توں بھیجتے تھے لیکن مواصلات کے ٹوٹ جانے سے اس کی زندگی دشوار ہوگئی اور یہ ستمبر 1947ء تک بند کر دیا گیا''۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ اس پر آشوب زمانے میں نہ صرف بعض کمزور اخبار بلکہ خوشحال اخبار بھی طباعتی اور دیگر دشواریوں کا شکار ہو گئے۔ جہاں نیوز پرنٹ کی دشواریاں پیدا ہوگیں وہیں ماحول کے انتشار کی وجہ سے کئی صحافی گھر بار چھوڑ کر اِدھر اُدھر چلے گئے۔ ان حالات میں کئی اخبار چھپنا بند ہو گئے اندازہ یہ ہے کہ ان دنوں اخبارات کی مجموعی تعداد دس بارہ رہ گئی تھی۔ اس افتداد کے باوجود 1950ء تک یہ پریس ایک عہد آفریں کردار ادا کر چکا تھا۔ حالات کچھ بہتر ہوئے ادھر ہندوستان کا دستور بھی 26 جنوری 1950ء میں پاس ہوگیا تو اس میں جموں وکشمیر کی ریاست کو بھی آئنی نظام کا حصہ بنایا ریاست میں حکومت بھی بن گئی جس کا رشتہ ہندوستان کے قانون اور جمہوریہ نظام سے منسلک تھا۔

ریاست میں عوامی حکومت کے آنے اور حالات کے بہتر ہونے سے اردو صحافت جس کے دیے میں کچھ رمق باقی تھی، پھر سے جلنے لگا۔ کشمیر میں اردو صحافت کے سفر کا ایک اہم دور ۱۹۵۴ء۔۱۹۵۵ء سے شدومد کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور تادم تحریر یہ سفر سینکڑوں روز ناموں ہفت روزوں اور ماہ ناموں کی شکل میں جاری وساری ہے۔ جن صحافیوں نے اس سفر میں ہراول دستے کا کام کیا ان میں مولوی محمد سعید مسعودی، غلام محمد کشفی، مفتی جلال الدین، مولوی غلام نبی مبارکی، مولوی قاسم شاہ بخاری، غلام محی الدین رہبر، عاشق کاشمیری، میر عبدالعزیز، نندلال واتل، غلام رسول عارف، شمیم احمد شمیم، خواجہ ثناءاللہ بٹ، صوفی غلام محمد، غلام نبی خیال، کرشن دیو سیٹھی، کارٹونسٹ بشیر احمد بشیر، فیاض احمد کلو، یوسف جمیل، طاہر محی الدین جیسے کہنہ مشق صحافی سرفہرست رہے۔

اردو صحافت کا یہ پہلو بھی کافی دلچسپ ہے کہ مذہبی اور سیاسی انجمنوں نے اپنے ترجمان اردو زبان

میں ہی جاری کیے۔نوائے صبح، خدمت، اذان، مسلم، توحید، وغیرہ اس کی زندہ مثالیں ہیں۔شیخ محمد عبداللہ، کرشن دیو سیٹھی اور سید میر قاسم نے اپنی اپنی روداد ہائے زندگی یا سوانحِ حیات لکھیں جس سے اردو ادب اور اردو صحافت کو بہت ترویج ملی اسی دوران جموں سے ویدراہی نے ''سویرا'' رسالہ نکالا موہن یاور نے ''سنگم'' اور نند گوپال باوا نے ''نوری چھم'' جیسے رسالے نکالے اس کے بعد آل سٹیٹ کلچرل کانفرنس نے اردو اور کشمیری میں ''کونگ پوش'' اور انجمن ترقی پسند مصنفین نے ''آزاد'' سری نگر سے نکالا۔''کونگ پوش'' بڑا میعاری رسالہ تھا اور ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا۔''کونگ پوش'' اردو کے صرف دو رسالے شائع ہوئے لیکن ''کونگ پوش'' کشمیری کافی عرصہ تک باقاعدہ شائع ہوتا رہا سن سنتالیس کے بعد ریاست میں جو ادب میں تبدیلیاں آئیں ان کے لئے ''کونگ پوش'' کا مطالعہ نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے ان کے علاوہ بھی ''گلزار'' ''دھنک'' ''پرتاپ'' ''لالہ رخ'' ''توی زون'' کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

باغ دلاور خان کے ہائر سیکنڈری اسکول نے اپنا رسالہ ''گاشہ آگر'' کا پُرانا نمبر شائع کیا آخر اس صحافت کے سفر کے کاروان میں شامل شمیم احمد شمیم جس نے حالات اور اس کا مشاہدہ کر کے خود کو بھی اسی کاروان کے زیر سایہ خدمات کرنے کی ٹھان لی اور رسالہ ''تعمیر'' کے اڈیٹر منتخب ہوئے اور اپنے مدیر محمد یوسف ٹینگ کی معاونت کے ساتھ ''ماہنامہ تعمیر'' کو ایک نئی جہت عطا کی اور اسے ملک کے اردو دان طبقے میں روشناس کرایا۔آخر کار انہوں نے صرف ایک رسالہ کو کافی نہ سمجھا اور اپنا ہفتہ واری اخبار سے 1964ء میں ''آئینہ'' شائع کیا جس کی وجہ سے شمیم صاحب نے وہ قابل قدر خدمات انجام دیں جو رہتی دنیا تک اردو صحافت اور اردو زبان کے لئے مددگار ثابت ہوتی رہیں گی۔ ادھر کلچر اکیڈمی کے وجود میں آنے سے اکیڈمی نے بھی اپنے قابل قدر کام شروع کر دئے تھے اردو میں کئی برسوں سے ''ہمارا ادب'' اور ''شیرازہ'' شائع ہو رہے ہیں۔شیرازہ نہایت ہی گرم جوشی سے اپنے سفر کو رواں دواں رکھے ہوئے ہے جو کہ ریاست میں اردو زبان و ادب کی ترویج کا ایک اہم حصّہ ہے۔ ہفتہ وار ''آئینہ'' جو بعد میں کچھ وقت روزنامہ بھی رہا اس سے متعلق تفصیلات آگے ابواب میں لکھی جائیں گی۔

****

۔حوالہ جات۔

۱۱۔گربچن چندن،اردوصحافت کا سفر،(ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۰۷،)صفحہ نمبر۔234.

۲۔ہفتہ وار رنبیر،۲۴ جون ۱۹۲۴ء جلد نمبر ۱،(جموں یونیورسٹی لائبریری)مشمولہ۔اردوصحافت کا سفر،(ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۰۷،)ص۔۲۳۸۔

۳ گربچن چندن،اردوصحافت کا سفر،(ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۰۷،)ص244

۴۔رنبیر،شمارہ نمبر 17،مئی 1950ء مشمولہ،گربچن چندن،اردوصحافت کا سفر(ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی ۲۰۰۷) ص250

۱۵۔محمد یوسف ٹینگ،کشمیر میں اردو،تاریخی پسِ منظر(ہماری زبان نئی دہلی۔۱۹۸۵)۔ص۲۶۴۔

****

باب دوم

شمیم احمد شمیمؔ کی حالاتِ زندگی اور شخصیت

شمیم احمد شمیمؔ کی حالات زندگی اور شخصیت

حالات زندگی۔

ریاست جموں وکشمیر کے نامور عالم دین اور سیاسی مفکر مولوی محمد عبداللہ وکیل علاقہ ٔکلر ڈسٹرکٹ شوپیان کے ایک دور دراز گاوں گتی پورہ نزد کریو مانلو کے ُلون' خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ایک بیٹے کا نام محمد یعقوب تھا۔ جو مولوی محمد یعقوب کے نام سے مشہور تھے حالانکہ پیشے کے لحاظ سے نہ وہ مولوی تھے اور نہ ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ موصوف قصبہ شوپیان میں دکانداری کرتے تھے جب کہ ان دِنوں ان کا زیادہ تر رہنا اپنے سسرال کے ساتھ تھا جن کی مستقل سکونت آسنور نزد اہرہ بل تحصیل کولگام میں تھی۔

1934 میں ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام شمیم احمد رکھا گیا۔ جو بعد میں شمیم احمد شمیم کا نام سے ریاست کے ادبی صحافتی اور سیاسی افق پر روشن ہوا۔ شمیم احمد نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاوں آسنور میں حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے شوپیان سے بارہویں جماعت کا امتحان پاس کیا، انہوں نے ایس۔ پی۔ کالج سری نگر سے گریجویشن کی تعلیم مکمل کی اس دوران ڈاکٹر فاروق عبداللہ ان کے کالج کے دوست تھے۔ کالج سے فراغت کے بعد بخشی غلام محمد صاحب جو اس وقت ریاست جموں وکشمیر کے وزیر اعظم تھے ان کی ایما پر انہیں محکمہ اطلاعات کے زیرِ سایہ ماہ نامہ ''تعمیر'' کی ادارت سپرد کی دراصل بخشی صاحب ان کے خاندان سے اچھی طرح واقف تھے اور شمیم صاحب نے بھی کمال کی ذہنیت پائی تھی اس سے پہلے کہ وہ کوئی قدم اٹھائے، ایک کام پر معمور کر دیا تاکہ دنیا محدود ہو جائے اور وہ کام سے مطلب رکھیں۔ اس دوران انہوں نے ماہنامہ ''تعمیر'' میں ''مہجور نمبر'' اور ''آزاد نمبر'' شائع کیئے جس کی بدولت پہلی بار لوگ مہجور اور آزادؔ کے فکر وفن سے روشناس ہوئے۔

اور کچھ دِنوں بعد شمیم احمد صاحب کو فیلڈ پبلیسٹی آفیسر کے عہدے پر ترقی دی گئی، لیکن سرکاری نوکری ان کو راس نہیں آئی اور وہ خود بھی ایک راہ کی تلاش میں تھے۔ بے باکی قدرت نے چونکہ کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس لئے نوکری سے استعفیٰ دے کر مزید تعلیم کی پیاس نے انہیں علی گڑھ یونیورسٹی پہنچایا اور ایل۔ ایل۔ بی۔ میں داخلہ لیا جہاں پر انہیں ایک ایسا ماحول ملا جس کی انہیں تلاش تھی۔ پیاسے کو سمندر مل گیا ُادّبا اور شعرا سے خوب فیض حاصل

کیا۔ان دنوں وہاں پر نامور ادیب خلیل الرحمٰن اعظمی کی محبت اور صحبت کا شرف بھی حاصل ہوا۔اس دوران علی گڑھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا زبردست بول بالا تھا۔شمیم احمد شمیمؔ بھی انجمن کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔آخر اپنی خداداد صلاحیتوں کا وہاں بھی لوہا منوایا۔اور انہیں انجمن کی کمیٹی کا جوائنٹ سیکریٹری چن لیا گیا۔یونیورسٹی کے پلیٹ فارم پر کھڑا ہونا ان کے لئے بہت بڑے اعزاز کی بات تھی،چونکہ یونین کے تاریخ ساز کام سے دنیا واقف تھی۔ادھر بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے قیام اور اس کے سرگرمیوں میں یونین کا اہم رول رہا ہے۔بھارت کی مسلم سیاست کا رخ بدلنے میں بھی یونین ایک اہم طاقت تھی وہیں تاریخ سن سنتالیس کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ تحریک پاکستان کے دوران اس یونین نے تاریخ ساز رول ادا کیا۔جس پر سیّد جون ایلیا مرحوم کا قول یاد آتا ہے۔

''یہ پاکستان۔سب علی گڑھ کے لونڈوں کی شرارت ہے''

اس لئے شمیم احمد کو بھی جب اس یونین میں آنے کا موقع ملا تو بہت مسرّت ہوئی اور یہاں وہ صرف کمیٹی کے ممبر نہیں بلکہ وہ یہاں گرجے اور برسے بھی یونین کے تحت ہونے والے تمام مباحثوں اور مناظروں میں اپنی دھاک بٹھادی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر منتخب ہوئے۔

ایل ایل بی کا کورس مکمل ہونے پر پیشہ وکالت شروع کیا جو کہ مزاج کے بالکل مختلف تھا لیکن چونکہ آمدنی کا کوئی خاص زریعہ نہ تھا جس کی بنا پر وکالت کرنی پڑی،اور اسی پیشے کو گلے سے لگایا۔اسی دوران 27 دسمبر 1963ء کو درگاہ حضرت بل سرینگر سے انحضور ﷺ کے موئے مقدس کی گمشدگی کا دلخراش واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف ریاستی حکومت کو ہلا کہ رکھ دیا بلکہ حکومت کی پالیسی ساز اداروں کے کشمیر سے متعلق منصوبوں پر بھی پانی پھیر دیا۔موئے مقدّس ایکشن کمیٹی کی تحریک نے ریاست کے بیشتر علاقوں میں حکومتی رِٹ کو ختم کر ڈالا۔مرکزی حکومت تحریکی لیڈروں کے ساتھ مزاکرات کرنے کے لئے مجبور ہوئی اس مجبوری کا اندازہ اس واقع سے لگایا جاسکتا ہے کہ بھارتی وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنے دست راست اور نائب وزیر اعظم لال بہادر شاستری کو خراب موسم کے دوران بھی سرینگر کے محلّہ بسنت باغ روانہ کر دیا۔

جہاں موئے مقدس ایکشن کمیٹی کے سرکردہ لیڈر مولانا محمد سعید مسعودی اور خواجہ غلام محی الدین قرہ محاز

رائے شماری کے ایک لیڈر خواجہ غلام محمد بٹ کے یہاں فروکش تھے۔ بٹ صاحب کے گھر میں ہی غلام محمد بخشی صاحب کی حمایت یافتہ شمس الدین وزارت کو برخاست کرنے کا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں 29 فروری 1964 کو خواجہ غلام محی الدّین قرہ کے کے بہنوئی خواجہ غلام محمد صادق کی بحیثیتِ وزیر اعلیٰ تاج پوشی کی گئی۔ صادق صاحب نے اقتدار سنبھالنے کے بعد ہی فوراً ریاست میں تحریر و تقریر کی آزادی کا اعلان کیا جس کے نتیجے میں چند نئے اخبارات کا اجرا ہوا جن میں ''محافظ''، ''جہلم''، ''وادی''، ''الغفران''، ''دلیر''، ''سوپور''، ''چنار'' اور ''آئینہ'' قابل ذکر ہیں۔ ہفتہ وار ''آئینہ'' شمیم احمد شمیم نے جاری کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس اخبار نے ریاست کے صحافتی، سیاسی اور ادبی حلقوں میں دھاک بٹھادی اور اس کی طرز تحریر اور جرأت مندی اور بے باکی نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس کا گرویدہ بنالیا نہ صرف ریاست میں بلکہ بیرون ریاست میں بھی اس کی مقبولیت کے چرچے ہونے لگے۔

شمیم احمد کی شخصیت ریاست کے ان گنے چنے صحافیوں میں سے تھی جن کو ریاست اور بیرونِ ریاست بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ شمیم احمد شمیمؔ کو خود بھی کتابوں سے بے پناہ محبت تھی اکثر وقت مطالعے میں گزارتے ان کے مطالعے کا اندازہ ان کی تحریروں سے ہوتا ہے وہ اپنا مطالعہ اپنے قارئین تک ''آئینہ'' کے توسّط سے پہنچاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ کوئی بھی ان کی تحریر پڑھ کر ان کا گرویدہ بن جاتا۔ ''آئینہ کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز شمیم احمد شمیمؔ کی دلچسپ تحریر میں مضمر تھا۔

''آئینہ'' کو ابھی چند ہی سال ہوئے تھے کہ شمیم احمد نے ریاست کے بگڑتے حالات اور سماج کی پسماندگی کو دیکھ کر صرف ''آئینہ'' کی خدمات کو کافی نہ سمجھا اور سیاسی میدان میں کود پڑے جہاں ایک طرف ''آئینہ'' کی خدمت بھی کرتے رہے وہیں دوسری جانب انہوں نے سیاسی میدان میں آکر قوم کے مستقبل کو بہتر بنانے کی بھی کوشش کی گو کہ تحریری، تقریری اور عملی طور سے ریاست کی عوام کی خدمت کرنے لگے۔ سن 1967ء میں انہوں نے شوپیان سے بحیثیتِ آزاد امیدوار ریاستی اسمبلی کا الیکشن لڑا۔ ان کے مقابلے میں کانگرس نے غلام حسن خان پنجپورہ شوپیان کو کھڑا کیا اس بات کا قوی امکان تھا کہ حسبِ قدیم حکومتِ ہند اور مقامی حکومت دھاندلیوں کے بل بوتے پر انہیں ہرادے گی۔

لہٰذا ریاست اور بیرون ریاست کے چند صاحب رسوخ شخصیتوں نے حکومتِ ہند اور الیکشن کمشنر مسٹر

سندرم کوخبر دار کیا کہ شمیم احمد کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے اتنا ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے نامور سماجی کارکن شری آر کے پاٹل نے جموں کے شری بلراج پوری کی معیت میں شوپیان کا دورہ کیا انجام کار شمیم احمد جیت گئے اور غلام حسن خان نے اتنی بڑی شکست کے بعد سیاست سے ہی سنیاس لے لیا آج تک عوام کے جو دکھ درد تحریروں میں لکھا کرتے تھے آج وہ سب عملی طور پر کرنے کا موقع بھی مل گیا، یوں اہلیانِ شوپیان کی بے لوث خدمت کی اور اسمبلی میں سچّائی کی آواز بن کر گرجنے لگے اور پہلی بار اسمبلی میں کرپشن، ناانصافی، اور ظلم وستم کے خلاف پہلی بار آواز اٹھائی جس کے نتیجے میں چند غنڈوں نے ان پر شوپیان میں ہی قاتلانہ حملہ کیا، وجہ یہ تھی کہ شمیم احمد نے ''آئینہ'' اخبار میں کروڑوں روپے کے گول مال کا سکینڈل، فیلڈ پبلیسٹی آفس میں دھاندلیوں کا سکینڈل اور محکمہ کسٹوڈین میں دھاندلیوں کے سکینڈل کا راز فاش کیا تھا اس زمانے میں محمد ایوب خان ارناس گول گلاب گڑھ کے پردیش کانگرس کے صدر تھے۔ شمیم احمد نے انہیں چیلنج کیا تھا،

''ہمارے شائع کردہ اعداد وشمار غلط ثابت ہوں گے تو ہم آئینہ کی اشاعت بند کردیں گے''۱

1968ء میں شیخ محمد عبداللہ نے سٹیٹ پیوپلز کنونشن کا اہتمام کیا اس سلسلے میں ریاست جموں وکشمیر کے سبھی علاقوں اور سیاسی و مذہبی تنظیموں کے سرکردہ لیڈروں کو دعوت دی گئی۔ یہ کنونشن مجاہد منزل سرینگر میں معقد ہوا۔ اس کا افتتاح بھارت کے نامور سیاسی لیڈر شری جے پرکاش نارائین نے کیا جنہیں سرینگر کی مختلف شاہراوں سے ایک جلوس کی صورت میں مجاہد منزل پہنچایا گیا۔ اس کنونشن کے اہتمام کی خاطر شیخ صاحب نے ایک سٹیرنگ کمیٹی تشکیل دی اور شمیم احمد کو بھی اس کا ممبر نامزد کیا گیا۔ چنانچہ اس کمیٹی میں شمیم احمد نے نہایت ہی جانفشانی اور خلوصِ نیّت سے کام کیا۔ 1971ء میں شمیم احمد نے پارلیمنٹ کا الیکشن لڑا، ابتدا میں انہوں نے دو انتخابی حلقوں سرینگر اور اننت ناگ سے کاغذاتِ نامزدگی داخل کئے لیکن بعد میں اننت ناگ سے دستبردار ہو گئے اور سرینگر حلقے پر دھان دیا کانگرس نے سابق وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد کو میدان میں اتارا، اور جماعت اسلامی نے اپنے محبوب لیڈر قاری سیف الدین کو کھڑا کیا جس دن کاغذات کی نامزدگی کی جانچ پڑتال ہوئی اس دن شمیم صاحب اپنے ساتھیوں غلام محمد باون ایڈوکیٹ، ہلال جالب پٹن، ڈاکٹر مبارک احمد سرینگر، غلام محی الدین شوپیان، رفیق فدا ایڈوکیٹ پلوامہ، محمد یوسف

ملک منیجر ’’آئینہ‘‘ کی معیت میں پیدل ڈی سی آفس سرینگر پہونچے وہاں پر بخشی غلام محمد کے حامیوں کا جمّ غفیر تھا۔

انہوں نے شمیم احمد کو دیکھتے ہی نعرہ بازی شروع کر دی لیکن پولیس کی مدد سے شمیم صاحب ریٹرنگ آفیسر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ جانچ پڑتال شروع ہوتے ہی بخشی صاحب کے وکلاء جو سب کے سب کشمیری پنڈت تھے انہوں نے یہ موقف اس لئے اختیار کیا کہ قاری سیف الدین جماعت اسلامی کے سرکردہ لیڈر تھے اور جماعت اسلامی آئین ہند کو تسلیم نہیں کرتی ہے لہٰذا قاری صاحب کے کاغذات کی نامزدگی رد ہونی چاہیے۔ قاری صاحب کے وکیل اور ان کے دو ساتھی اس درجہ کے سہمے ہوئے تھے کہ وہ بول ہی نہیں پائے اس موقع پر شمیم احمد شمیمؔ نے قاری صاحب کے اس کیس کو زور دار طریقے سے جوابات دئے۔ اور عدالت سے درخواست کی کہ قاری صاحب کے کاغذاتِ نامزدگی داخل کئے جائیں اور نامزدگی منظور کی جائے کیوں کہ انہوں نے آئین ہند کی وفاداری کا حلف اٹھایا ہے۔ لیکن بخشی صاحب کے وکلاء نے اس بات پر زوردار طریقے سے اعتراض کیا کہ قاری صاحب ریاست جموں وکشمیر کو ہندوستان کا اٹوٹ انگ نہیں مانتے۔ اسی وجہ سے وہ آج کل سینٹرل جیل میں بند ہیں۔

اس پر شمیم صاحب نے گرج دار آواز میں کہا۔ چونکہ قاری صاحب نے اپنے کاغذات کے ساتھ ساتھ این۔ او۔ سی۔ کا فارم بھی ساتھ لگایا تھا۔ آئین ہند الیکشن کمیشن کے قوعد وضوابط کی رُو سے ان کے کاغزات رد کرنا غیر قانونی ہے۔ شمیم احمد شمیمؔ کے اس موقف کو عدالت نے تسلیم کر لیا اور قاری صاحب کے کاغذات قبول کر لئے شمیم احمد شمیمؔ کے اس روّے نے یہاں کے سیاسی اور مذہبی حلقوں کو حیران و پریشان کر کے رکھ دیا کیوں کہ جماعت اسلامی کے ساتھ ان کے تعلقات حد درجہ کشیدہ تھے یہاں تک کہ جماعت اسلامی والوں نے شمیم احمد کو کافر تک کہہ دیا تھا جس پر غلام رسول نازکی اور عائشہ بھٹ نے جماعت اسلامی والوں کو آڑے ہاتھوں لیا یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کے عدالتی کمرے سے باہر آتے ہی بخشی صاحب کے حامیوں نے شمیم احمد شمیمؔ اور اس کے ساتھیوں کے خلاف انتہائی غیر مہذبانہ رویّہ اختیار کیا اور ان کے ایک ساتھی ڈاکٹر مبارک احمد کا مفلر بھی اڑا لیا گیا لیکن پولیس کی بروقت مدد سے یہ سبھی حضرات محفوظ رہے

قابل ذکر بات یہ ہے کہ بخشی صاحب شمیم احمد کو اپنے لئے خطرہ نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں صرف جماعت اسلامی کا ہی ڈر تھا۔ الیکشن مہم شروع ہوتے ہی بخشی صاحب کے حامیوں نے سرینگر گاندربل اور بڈگام وغیرہ کے

علاقوں میں زوردار طریقوں سے اپنی سرگرمیاں شروع کردیں۔شمیم احمد شمیمؔ کے ساتھ اس وقت چند سو ہی مدّاح تھے لیکن جب شیخ محمد عبداللہ نے شمیم احمد شمیمؔ کی حمایت کا اعلان کیا تو لوگوں نے خوف ودہشت کی زنجیروں کو توڑ کر شمیم صاحب کو ہاتھوں ہاتھ کے لیا۔شیخ صاحب ان دنوں دہلی میں جلاوطن تھے لہٰذا ان کی طرف سے بیگم شیخ عبداللہ نے خانیار سرینگر پارک کے جلسے عام میں حمایت کا اعلان کیا۔شمیم احمد کی الیکشن مہیم کی کمان مولانا مسودی اور خواجہ غلام محی الدین نے سنبھالی۔بیگم شیخ محمد عبداللہ نے بھی گاوں دیہاتوں میں جا کر لوگوں کو حمایت کی تلقین کی۔اس دوران چرار شریف میں شمیم احمد اور انکے ساتھیوں پر حملہ کیا گیا۔جس میں شمیم احمد رفیق فدا ایڈوکیٹ غلام محی الدین ٹاک وغیرہ زخمی ہوئے اس واقع نے کشمیر کو ہلا کر رکھ دیا اور ماحول بھی شمیم احمد کے حق میں سازگار ہو گیا۔اور بالآخر الیکشن میں کامیابی ہوئی اور شمیم احمد شمیمؔ پارلیمنٹ کی زینت بن گئے۔پارلیمنٹ میں انہوں نے اپنی خطابت،نکتہ فہمی،اور حاضر جوابی سے ایک بلند مقام حاصل کیا۔

انہوں نے پارلیمنٹ میں نہایت ہی زوردار طریقے سے کشمیریوں کے مسائل کو زیر بحث لایا۔شمیم احمد شمیمؔ سے قبل بھارتی پارلیمنٹ میں مولانا محمد سعید مسعودی،شیخ محمد اکبر بارہ مولہ،صوفی اکبر سوپورہ،پنڈت موتی رام بیگڑہ اودھم پور،مولوی عبدالرحمٰن جموں۔کوشک بکولہ لدّاخ۔،کامریڈ محمد شفیع میر پوری،غلام قادر گاندربلی المعروف شیر گاندربل،علی محمد طارق،سیّد محمد شاہ جلالی،سردار بدھ سنگھ،برگیڈئر گھنسارا سنگھ وغیرہ نے شمیم صاحب کے ساتھ ریاستؔ کی نمائندگی کی۔

لیکن مولانا مسعودی صاحب کے سوا کسی نے بھی اپنا منہ نہیں کھولا۔مولانا مسعودی صاحب نے جو تقریریں کیں وہ پڑھنے کے لائق ہیں۔شمیم صاحب نے کشمیر کے سیاسی،جغرافیائی،اقتصادی،تعلیمی معاشرتی، مسائل وغیرہ کو نہایت ہی جرأت مندی اور صاف گوئی سے پیش کیا اور ایوان نے ہمیشہ ان کو کان کھول کر سنا حالانکہ وہ ایک آزاد امیدور کی حیثیت سے وہاں داخل ہوئے تھے انہوں نے فرقہ پرستوں کو بے نقاب کیا جس پر انہیں پاکستانی ایجنٹ ہونے کا الزام بھی لگایا گیا لیکن انہوں نے سرینڈر نہیں کیا بلکہ حق گوئی کو اپنا شعار بنالیا پارلیمنٹ میں کشمیریوں کے حقؔ کی بات کرتے رہے۔

شمیم احمد شمیمؔ نے صرف کشمیریوں کے مسائل ہی کو نہیں اٹھایا بلکہ بھارتی مسلمانوں کے ساتھ کی گئی

زیادتیوں اور نا انصافیوں کو بھی اجاگر کیا۔سن 1975 ء میں جب اندرا گاندھی نے ملک پر ایمرجینسی لگا دی تو ہزاروں سیاسی ورکروں کو پابند زنداں کیا گیا۔ پریس پر بھی رکاوٹ لگا دی گی ہر طرف حالات بگڑے ہوئے تھے۔ شمیم احمد نے تنِ تنہا اس وقت بھی مخالفت کی اور زوردار طریقے سے کی اور مفاد پرستوں اور چاپلوسی کرنے والوں کی خوب اچھے سے خبر لی۔

پارلیمنٹ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل پر بولتے ہوئے شمیم احمد نے کہا تھا:

''آزادی کے 25 سال بعد بھی ابھی تک مسلمانوں کو اس ملک میں
تعلیم اور ترقی کے مواقع حاصل نہیں ہیں کہ جن کی ہندوستانی آئین
میں ضمانت دی گئی ہے۔''۲

اسی جوان مردی کے ساتھ شمیم احمد صاحب نے تحریر وتقریر دونوں سے اور جب طاقت کی باگ ڈور ہاتھ آئی تب بھی عوام کی وہ خدمات کی ہیں جو رہتی دنیا تک کشمیر اور بیرون ریاست کے لوگ یاد کریں گے آخر میں ان پر سرطان کا حملہ ہوگیا۔ دو سال علالت میں رہنے کے بعد اس دنیا فانی کو شمیم صاحب کی شخصیت الوداع کہہ گئی آخر 1980ء میں شمیم صاحب سیّد منصور صاحب رحمتُ اللہ علیہ کے آستانہ کے بغل میں سپرد خاک ہوئے ،ان کی تُربت پر جو کتبہ نصب کیا گیا جس پر یہ تحرر ہے۔

اے مردِ جواں مرگ شمیم !اے درنایاب
روتے ہیں تیری قبر پہ اعدا ہوں کہ احباب
اس مصرع تاریخ میں ہے ضبط تیری ذات
تھا صحن گل و صاعقہ شعلہ و سیماب۔

****

شمیم احمد شمیمؔ کی شخصیت ۔

قابل غور بات یہ ہے کہ شمیم احمد شمیمؔ کے بارے میں ہماری نئی نسل نہیں جانتی اس کی کئی جوہات ہوسکتی ہیں سب سے بڑی وجہ دور حاضر کے نوجوان کو اپنے اکابرین اور تاریخ کو پڑھنے کا ذوق نہیں رہا ان میں اہم شخصیات کی زندگی کا مطالعہ نہیں کرتے جو ہماری زندگی کے لئے مشعل راہ ثابت ہوسکتی ہیں۔ ہم سے بہت پہلے کی نسل جو 1960ء اور 1980ء کی دو دہائیوں میں عالم شباب میں تھے، جن کو یا تو موت نے فرصت نہیں دی یا پڑھاپے کی حالت میں ہیں۔ خصوصاً وہ احباب جنہیں تعلیم، سیاست اور ادب سے دلچسپی تھی۔ شمیم صاحب کی شخصیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شمیم احمد شمیمؔ کی شخصیت ریاست جموں وکشمیر کیا برّصغیر میں اہمیت کی حامل تھی۔

شمیم احمد شمیمؔ ایک متنوع شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک ایسے صحافی تھے جن کے قلم میں سادگی کے باوجود کافی زیادہ اثر تھا وہ ایک نکتہ دان تھے عظیم مقرر تھے وہ ایک دانشور تھے وہ شہرت یافتہ شخصیت ہیں اگرچہ ریاستی اور ملکی سطح پر ان کے دور میں اور بھی بڑی بڑی شخصیات تھیں، لیکن ان سب میں شمیم احمد شمیمؔ کی جو انفرادیت ہے وہ یہ ہے کہ ان کی سوچ سب سے الگ تھلگ تھی وہ بیک وقت صحافی، سیاست دان، دانشور، مجاہد اور طنز و مزاح نگار تھے اور سوچ سب سے منفرد یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بڑے امور پر اپنے آپ کو اختلافی حالت میں پاتے تھے۔

پروفیسر حامدی کشمیری شیم احمد شمیمؔ کے بارے میں کہتے ہیں کہ۔ ’’اہل کشمیر صدیوں سے غلامی اور افلاس کے ہاتھوں اپنی شخصیت اور وجود کی قوّتوں کا احساس کرنے سے محروم رہے ہیں موجودہ دور میں شمیم احمد شمیم میں مجھے ایک ایسا نوجوان نظر آیا تھا جو جرأت فکر اور گفتار سے کام لے کر کشمیر کی زرخیزی اور تر دماغی کا زندہ پیکر بن کر ابھرے گا وہ جس محفل میں محوِ گفتار ہوتے تھے کوئی دوسرا جرأت سخن نہیں کرتا تھا۔

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کا بعد صورت دیوار میں آوے‘‘ [1]

شمیم احمد شمیمؔ کی شخصیت نے کبھی ہار تسلیم نہیں کی کبھی ان کے چہرے پر دکھ غم پریشانی کا ملال نہیں ہوتا

تھا۔شکست قبول کرنا ان کے ضمیر میں ہی نہیں تھا۔ وہ ہر حال میں اپنی صداقت اور اپنی فطری ظرافت اور اپنی خوش گفتاری سے دوسروں کو زندہ رہنے کا سلیقہ اور شعور عطا کرتے تھے۔ 1997ء میں جب ان کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ بھی آیا کہ جب حاکمانِ وقت نے انہیں برزلہ میں واقع اپنے رہائشی مکان سے بے گھر اور دوسری جائداد سے ان کی غیر موجودگی میں محروم کر دیا تو شیر خدا کے ماتھے پر ذرا شکن تک نہ آئی اور خود کہتے ہیں کہ مجھ پر جتنی بھی قیامتیں آئیں انہوں نے میرے حوصلوں کو شکستہ کرنے کے بجائے کچھ اور تازہ دم کر دیا خود ایک بار کہا تھا کہ مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ میرے رہائشی مکان پر حملہ کرنے والی فوج نے آدم کے کھلونے تک توڑ ڈالے۔

وہ ایک شفیق باپ اور اور اپنی رفیقہ حیات کے وفا شعار ساتھی تھے۔درا صل آدم ان کے اکلوتے فرزند اور سب سے کمسن اولاد کا نام ہے جب ان کے یہاں یہ بیٹا آدم پیدا ہوا تو انہوں نے برزلہ کے رہائشی مکان میں خوشیوں کے چراغ جلائے تھے اور وہیں اپنے دوستوں کو ایک پارٹی بھی دی تھی۔

اپنی سخت ترین مصروفیات ہونے کے باوجود ان کی یہی کوشش رہتی کہ میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ کچھ وقت گزاروں یہاں تک کہ اتوار کا وقت وہ اکثر گھر میں گزارتے ایک مرتبہ چند دوستوں نے غلام محمد صادق صاحب شمیم صاحب کی وساطت ملنے کا پروگرام بنایا اور وقت اتوار 9 بجے کا مقرر کیا جب ان کو مطلع کیا گیا تو یک دم بھڑ ہم ہو گئے فرمایا:۔

> ''آپ کو تو ذہنی عیّاشی کے لئے صادق صاحب کے پاس جانا ہے اور یہ کوئی موت وحیات کا مسلہ نہیں ہے اور نہ ہی کسی کی مجبوری کا معاملہ ہے۔اتوار کا دن میں اہل وعیال کے لئے رکھتا ہوں''۔بعد میں دوستوں کی خواہش کا احترام کر ہی لیا تھا''[۳]

اپنے بچوں سے بے پناہ محبت تھی لیکن اپنے بچوں کی خاطر کسی کے سامنے کبھی جھکنے کو تیّار نہ ہوئے ان کے ذہن پر اپنے اہل خانہ کے مفادات کا بھوت کبھی سوار نہ ہوا بلکہ جتنے آلام ومصائب انہوں نے اپنے اہل وعیال کو عطا کئے اور جتنی صبر آزما اور کٹھن آزمائشوں میں انکو مبتلا کروایا۔کشمیر کی سیاسی تاریخ میں کسی بھی قائد نے شائد ایسا کیا ہو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی غیور طبیعت نے ہمیشہ سمجھوتوں سے گریز کیا انہوں نے کبھی بھی اپنی آزادیِ ضمیر کا سودا نہ کیا

ان کے کردار کی اس خصوصیت نے ان کو گھر سے بے گھر کر دیا لیکن ان کی طبعیت کی اس کجکلاہی نے ان کے کمسن بچوں کو بھی تنگی حالات اور تلخی ایّام کی پریشانیاں عطا کیں ڈاکٹر وحید صاحب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

''اپنی آنکھوں سے اس قسم کے حالات کو میں نے دیکھا اور میں گھبرا گیا اور جب شمیم بستر علالت پر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے تو میں نے ان سے کہا۔ شمیم صاحب۔اب جبکہ آپ کی پوری زندگی ایک سوالیہ علامت بن کر رہ گئے ہے۔تو اصولوں اور آدرشوں کی جنگ حاکمان وقت کے ساتھ معرکہ آرائیاں اور ناانصافی کے خلاف جدوجہد سب کچھ بے کار اور غیر متعلق سا لگ رہا ہے۔آپ کے کمسن بچے گھٹن اور آزمائشوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ان پر غم و اندوہ کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔آپ اپنے سخت روّے میں تھوڑی سی لچک پیدا کر کے ان کا جینا کچھ حد تک آسان بنا سکتے ہیں۔تو شمیم صاحب نے جواب دیا۔ ''اگر آسماں سے کوئی فرشتہ اترے اور مجھ سے یہ کہے کہ حاکمان وقت کے ساتھ سمجھوتہ کے عوض آپ کو زندگی کے مزید دس سال ملیں گے میں وہ سودا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ میں اس فرشتے سے کہوں گا کہ سمجھوتے کی زندگی سے موت کو ہی ترجیح دیتا ہوں۔''[۱۴]

شمیم احمد شمیمؔ نے اپنی زندگی میں آنے والے ہر طوفان سے ڈٹ کر مقابلہ کیا اس بات کا اندازہ ڈاکٹر وحید صاحب کے واقع سے ہو سکتا ہے کہ سمجھوتے کی زندگی پر موت کو شمیم احمد شمیمؔ نے ترجیح دی یہ ان کے کردار کی خصوصیت تھی۔شمیم احمد شمیمؔ اپنی بیماری کے مہلک انجام سے باخبر ہونے کے باوجود مرتے دم تک ہنستے مسکراتے رہے وہ ایک بہادر سپاہی تھے بستر علالت بر جب دوست احباب مزاج پرسی کو جاتے تو ایک دفعہ ایک دوست نے ان کی پیشانی چوم لی اور ہاتھوں پہ بوسا دیا اور ایسا کرتے اس کی آنکھوں میں آنسوں اتر آئے اس پر انہیں دلاسا دیا۔

انہوں نے ہمیشہ ہمت حوصلے سے کام لیا دوست جوان کی مزاج پرسی کو جاتے حیران و پریشان ہو جاتے ایک روز

شدّت بیماری سے انہیں رات بھر نیند نہیں آئی اور ان سے کہا گیا کہ دوائی کی گولی لے لیں تا کہ تھوڑی دیر آرام مل سکے۔تو فوراً انکار کر دیا دوائی نہیں لوں گا جاگتے جاگتے تھک جاؤں گا سو جاؤں گا وہ موت اور درد کی قوّتوں کے ساتھ اپنی فطرت کی خصوصیت کے عین مطابق مقابلہ کرتے رہے۔موت کے فرشتے کے ساتھ بھی بغیر مقابلہ ہتھیار ڈالنا انہیں راس نہیں آیا۔

امریکہ سے ایک مرتبہ اپنے دوست ڈاکٹر وحید کو خط لکھا اور لکھا کہ تم تو ڈاکٹر ہو تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں جس بیماری میں مبتلا ہوں اس کا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہیں زندگی اور موت کی قوّتوں کے درمیان جو جنگ چل رہی ہے انجام کچھ بھی ہو میں یہ ضرور کہ سکوں گا ''مقابلہ تو دِل ناتواں نے خوب کیا''۔

مقابلہ کرنا ان کی ساری زندگی کا شغل رہا ہے جب 1977ء میں شیخ صاحب نے انہیں پارلیمنٹ کا منڈیٹ نہیں دیا تو وہ خاموش تو نہ رہ سکتے تھے اور ان سے کہا گیا کہ پارلیمنٹ کی ممبری نہ سہی اس سے بھی بڑھ کر کوئی مناسب اور موزوں عہدہ آپ کو دیا جائے گا لیکن ان کو منڈیٹ نہ دینے سے نہیں بلکہ منڈیٹ نہ دینے کی اصل وجہ سے بڑا دکھ ہوا تھا انہوں نے اس اصل وجہ کو لیڈرانِ وقت کی مصلحت سے تعبیر کیا اور اس مصلحت کے خلاف مقابلہ کرتے رہے انہیں یقین نہ آتا تھا کہ ہماری قیادت مسز اندرا گاندھی کی پسند اور ناپسند کے سامنے مجبور ہو کر اپنی بے بسی کا کھلا مظاہرہ کرے گی۔ایمرجنسی کے دوران سارے ملک پر موت کی سی خاموشی طاری ہوگئی تھی اور آزادیِ فکر کے بڑے بڑے دعویداروں نے مسز اندرا گاندھی کی چاپلوسی اور سنجے گاندھی کی خوشنودی میں ہی اپنی عافیت سمجھی تھی لیکن شمیم احمد کی تنہا آواز مسز گاندھی پر گرجی اور ایمرجنسی کے خلاف کچھ ایسے ڈٹ گئے کہ اندرا گاندھی کے لئے دردسرہ رہے اور بقول روزنامہ سٹیٹس مین ٹائم 1980ء ایمرجنسی کے پہلے مرحلے میں تنِ تنہا لوک سبھا میں لڑتے رہے اور حکمرانوں کو انتباہ دیا کہ عوام کا قہر وغضب ایک دن ان کو بھسم کر ڈالے گا ان حالات میں وہ اندرا گاندھی کے لئے ناپسندیدہ شخصیت بن گئی۔اور منڈیٹ دیتے وقت اسی پسند ناپسند کو معیار بنایا گیا۔

شمیم احمد شمیمؔ نے کہا کہ میں اس آزادیِ فکر اور آزادیِ ضمیر کی موت کا ماتم کر رہا ہوں ورنہ انہیں اقتدار سے نہیں افکار سے لگا تھا جب انہوں نے 1977ء میں جنتا پارٹی میں شمولیت اختیار کی تو مرار جی دِسائی نے شوپیان کے انتخابی جلسے سے مخاطب ہو کر کہا۔''یہ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ میں شمیم کی خاطر اسمبلی کی ممبری کے لئے

ووٹ مانگ رہاہوں ورنہ میں ان کو پارلیمنٹ میں دیکھنا چاہتا تھا''۔

مرارجی ملک کے وزیراعظم تھے۔اور جنتا لہر کی اٹھان کے ساتھ انکا قد بلند تھا۔شمیم احمد شمیمؔ انتخاب ہار گئے لیکن ملک کی برسرِ اقتدار جنتا کے ساتھ ان کے تعلقات کافی مستحکم تھے اورانہیں کسی ملک میں سفیر بنانے کا منصوبہ بھی زیرِ تکمیل تھا۔شمیم کسی ایسے مک میں سفیر بن کر جانا چاہتے تھے جہاں ایک طرف ان کی مہم پسند طبیعت کو تسکین مل جاتی اور ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی بگڑی ہوئی صحت کا علاج بھی ممکن ہو پاتا یہی خواہش لے کر وہ مرارج کے پاس گئے۔

لیکن بات یوں ہوئی کہ وہاں جا کر شمیم احمد شمیمؔ نے اپنا نہیں مرارجی کے بیٹے کانتی ڈیسائی کا کیس اٹھایا مرارجی کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ کر شمیم احمد شمیمؔ نے ایک ہی ملاقات میں ان کو زخمی کیا اوران کی محفل سے واک آوٹ کیا اورایک پریس کانفرنس میں کانتی ڈیسائی کے کرتوتوں کو بے نقاب کیا۔کچھ دوستوں نے ان سے اس وقت کہا کہ حالات سازگار نہیں مرارجی سے رزم آرائی اِن کی ذات اوران کے مستقبل کے لئے بہتر نہیں ہوسکتی تو شمیم صاحب نے جواب دیا:۔

مجھے خود معلوم نہیں میں بیک وقت تنِ تنہا کتنی لڑائیاں لڑوں''۔

مقام فیض! کوئی راہ میں جچا ہی نہیں

جوکوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔

طبیعت ہی کچھ ایسی مل گئی ہے کہ جس سے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔میں کیسے اس ضعیف الاعتقاد اورخود کو گاندھیائی کہنے والے شخص کی باتوں اوراس کی منطق کو تسلیم کروں۔مجھے معلوم ہے کہ میری فطرت مجھے کیا صلہ دے گی۔

ہاں تلخیِ ایام ابھی اور بڑھے گی

ہاں اہل ستم مشق ستم کرتے رہیں گے۔''۵؎

شمیم احمد شمیمؔ نے تلخی ایام سے کبھی شکست قبول نہ کی وہ اپنے دوستوں اور رفیقوں کی محفل میں اپنی پر بہادری اور دلنوازی سے مشہو تھے وہ اپنے دشمنوں سے بھی دوستانہ اورمشفقانہ روّیہ رکھتے تھے۔

رائے شماری کا دلفریب نعرہ ہر کشمیری کے ایمان کا جز بن گیا تھا لیکن شمیم احمد نے اس قسم کے تعصّبات اور نظریات کے خلاف اپنے زورِ قلم سے ایک ایسی مہم چلائی اور اپنے نظریات کی پختگی سے ایک ایسا ماحول پیدا کیا کہ رائے شماری کا نعرہ بے مقصد نا قابلِ عمل اور فرسودہ ہونے لگا۔ انہوں نے 1969ء میں پیپلز فورم کے نام سے نوجوانوں کے ایک گروپ کو منظّم کیا جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کی پارٹی کو مقبول خاص نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس جماعت کے نظریات ہندنواز ہیں اور آپ ہند سے کشمیر کے الحاق کو تسلیم کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ کشمیر میں ہندنواز جماعتوں کا دائرہ اثر صرف ان کے دفاتر تک ہی محدود ہے؟۔ تو انہوں نے اس کا جواب یوں دیا۔

''یہاں کے اکثر ہندنواز لیڈر اور ورکر محض ہندوستان کے ایجینٹ ہیں۔ انہوں نے جان بوجھ کر مرکز اور ہمارے درمیان شک و شبہات بداعتمادی اور بے اعتمادی کی فضا قائم کرنے کا مکروہ فریضہ انجام دیا ہے تا کہ وہ اپنی وفاداری کے عوض مفادات حاصل کرسکیں۔ میں ہندوستان کے ایجینٹ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک کشمیری کی حیثیت سے منفی سیاست کے مضر اثرات اور اس کی فرسودہ حیثیت کچھ اس رنگ سے ابھارنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں کہ غیر یقینیت کی فضا مسمار ہوسکے میں مرکز اور ریاست کے درمیان تعلقات کو ایک ایسی سطح پر لانا چاہتا ہوں کہ جہاں استحصال کا نظام ختم ہوسکے یہ درست ہے کہ کشمیر کے جذباتی ماحول میں یہ فریضہ انجام دینا بہت ہی مشکل ہے میں لوگوں کے جذبات سے کھیل کر سستی شہرت اور دادِ تحسین حاصل کرسکتا ہوں لیکن مجھے قطعاً اس سیاست پر اعتقاد نہیں۔ اور نہ ہی انور عشاء اور بشیر کچلو کی طرح میری یہ خواہش ہے کہ رائے شماری اس قسم کے دلفریب نعروں سے لوگوں سے داد حاصل کروں اور لیڈر بن جاؤں مجھے لیڈر بننے کا شوق نہیں اگر سارے کشمیر میں ایک ہزار نوجوان حقایق کو سمجھنے

میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تو میں اسے اپنی پوری فتح تصور کروں گا۔
اور ممکن ہے کہ کل کو شیخ محمد عبداللہ مرزا محمد افضل بیگ مولوی فاروق بھی
میرے نظریات کو صحت اور میرے عقائد کی سچائی پر ایمان لائیں گے
''۔٦

شمیم دراصل صحیح معنوں میں کشمیر اور ہندوستان کی سیاست اور ریاست اور مرکز کے درمیان تعلقات پر ایک بالغ نظر اور پختہ رائے رکھتے تھے انہوں نے اپنی فکر انگیز تحریروں سے اس رائے اور اس نظر کو عام لوگوں تک پہنچا دینے کا فرض اس حسین انداز سے نبھایا کہ جذباتیت کی قدر و قیمت میں کمی واقع ہونے لگی۔ اور حق شناسی اور حقیقت پسندی کا رجحان بڑھتا گیا۔

شمیم صاحب دیکھنے میں رومان پسند لگتے تھے۔ حسن صورت اور شوخی اس شخصیت کا حصّہ تھے۔ لیکن شمیم ہر حال میں خدا پر بھروسہ کرنے والے اور ہر حالت میں اسی سے مدد مانگنے والے پکے مسلمان تھے۔ سیاست اور ادب کے ساتھ ساتھ ان کی دینی امور پر بھی خاصی نظر تھی۔ اگر چہ باقاعدگی کے ساتھ نماز کے پابند نہیں تھے۔ وہ اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ نماز جمعہ ادا کرنے حضرت بل آجایا کرتے ان کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے عظیم انقلابی رہنما ہیں۔ لیکن ملاؤں اور مذہب کے ٹھکیداروں نے مذہب کو چند عقائد اور رسوم کے طور پر پیش کیا ہے۔ انہیں پریم ناتھ بزاز کی صحافت سے عشق تھا۔ وہ مولانا مسعود کی سادگی کی قسم کھاتے تھے۔ لیکن ان کی عافیت پسندی مصلحت اور منطق سے بیزار تھے وہ شیخ محمد عبداللہ کو کشمیر کے سب سے مقبول لیڈر کی حیثیت سے تسلیم کرتے تھے لیکن ان کی شخصیت کے کسی بھی پہلو نے انہیں متاثر نہیں کیا تھا وہ سیّد میر قاسم کے خلوص اور شرافت کے زبردست قائل تھے خود فرماتے ہیں کہ ''میں نے عمر بھر قاسم صاحب کے خلاف زہر اگلا لیکن میری عمر کے آخری حصّے میں وہ میرے کام آئے اور میں ان کا احسان مند ہوں'' وہ اقبال کے تصوّرِ خودی کا مجسمہ تھے لیکن غالب اور فیض احمد فیض کے اشعار سے انہیں کلام کی شوخی ملی تھی وہ مرحوم زلفقار علی بھٹو کی رومانی شخصیت کے گرویدہ تھے۔ ان کا اسٹائل ان کی ادا نہیں ان کی پسند تھی جب ذلفقار علی بھٹو قتل کئے گئے تو انہیں بے حد صدمہ پہنچا اور فیض احمد فیض کے چند اشعار آئینہ کے پہلے صفحے پر ان کی نظر کئے۔

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن، میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو

کہ غرور عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو

جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جان سے گزر گئے

رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یاد گار بنادیا

پروفیسر رحمان راہی شمیم احمد شمیمؔ کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''وادیِ خاموشاں کو زندگی کی انتہائی منزل قرار دیتے ہوئے گنبد افلاک میں فی الوقت غلغلہ اندازی کی جو بات حافظ شیرازی کہہ گئے ہیں۔ مجھے اس کے پردے میں شمیم احمد شمیم کی بات محسوس ہوتی ہے۔ موت سے پہلے جو آدمی کو تھوڑی بہت فرصت ملتی ہے اس کا استعمال زندگی کہلاتا ہے۔ اور اس فرصت کو برتنے کا انداز زندگی کی کیفیت اور کوالٹی متعیّن کرتا ہے۔ فرصت کم سے کم بھی ہوسکتی ہے اور زیادہ سے زیادہ بھی۔ مقدار کے اعتبار سے ہم کم بھی جی سکتے ہیں اور زیادہ بھی زندگی کی صبح کو اکثر لوگ جوتوں شام کر ڈالتے ہیں جب کہ کسی کسی کو ایک ایک لمحے کا حساب دینا پڑتا ہے سو سال بھی جی کر بھی کسی کے تجربات کا اندوختہ حقیر ہوتا ہے جب کہ کسی کی چند روزہ وارداتیں بڑی وافر ہوتی ہیں اس روشنی میں شمیم احمد شمیمؔ کو یاد کرتا ہوں تو انکی خوش حاصلی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہاں کشمیر کے ایک نہایت ہی دور افتادہ اور پچھڑے ہوئے گاؤں آسنور میں پیدا ہونے والا شمیم احمد اور کہاں یورپ وامریکہ کی ہوا کھا کر دنیا کی سب سے بڑی پارلیمنٹ میں اپنی

آتش بیانی کی دھاک بٹھانے والے شمیم احمد وہ سائنس کا طالب
علم۔وہ شعروادب کا رمز شناس۔وہ فنِ صحافت کی اقتدار میں وسعت و
برتری پیدا کرنے والا۔وہ نکتہ سنج اور نکتہ چیں۔ وہ طنز کو الماس میں
بدلنے والا جادوگر، وہ احتجاج کرنے والا ہوشیار ذہن،حسّاس دل اور
وہ قدرت کے اٹل قوانین کے آگے صابروشاکر وہ زشت شناس وہ زیبا
پرست،وہ مباحثہ ساز،مناظرہ کار،وہ حامی وہ مخالف،وہ وفا شعر وہ
صف آرا۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہووہ شبنم
دل جس سے پہاڑوں کے دہل جائیں وہ طوفان ''ے

شمیم احمد شمیمؔ نے جومختصر زندگی پائی وہ اوّل تا آخر ایک گونجتی آواز بنی رہی۔ایک ایسی آواز جس کی گونج برابر سنائی دیتی ہے،اورانشااللہ سنائی دیتی رہے گی مرحوم ایک بت شکن آدمی تھے وہ کشمیر کی تاریخ کے با قاعدہ ایک باب ہیں اگر چہ مختصر ہی صحیح۔کیوں کہ وہ ایک بیقرار دل اوران کی ذات میں نا قابل شکست اناتھی۔

یہ بات قابل غور ہے کہ شمیم صاحب کے بارے میں جس نے بھی لکھااور جس سے بھی سناسب سے مرحوم کے اوصاف ہی گنائے۔وہ وہ شخصیت تھی بھی تعریف کے قابل ہی لیکن آخر کوئی شخص دنیا میں حضرت محمدﷺ کے بغیر مکمل نہیں اس سلسلے میں جب شمیم احمد شمیمؔ کی تحریروں کو یعنی بنیادی ماخذ اوران کے افکاروخیالات کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی تو بعض موقعوں پران سے اتفاق نہ ہوسکا جہاں وہ ایک طرف کشمیری قوم کی بلندی اور کامیابی کے خواب دیکھتے تھے وہیں شمیم احمد شمیمؔ کشمیر کی ثقافتی زندگی اورلسانی صورت حال کے بارے میں مرحوم کے جوخیالات و تاثرات تھےان سے میرااختلاف ہوتا ہے۔

شمیم احمد شمیمؔ جوش وجزبے سے جم غفیرکواپنی شعلہ بیانی کا گرویدہ بنالیتے تھےعوام آنکھیں جھکائے بغیراس کی آواز کی صداقت کومحسوس کررہے تھے وہ باربارمسلمانوں کی غفلت اورحکمران طبقے کےخلاف ان کے دماغ کوان کی پالسیوں سے بچانے کی کوشش میں تھے۔ان کی آواز اتنی نوکیلی تھی کہ انسان کی روح میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی

تھی دوران جلسہ باقی مقررین ان کی تقریر سن کر شرمندہ ہو جاتے کہ اب ہم کیا بولیں۔

شمیم احمد شمیمؔ ایک مرد بے باک تھا ایک جلسہ 1977ء میں منعقد کیا گیا جو کہ جنتا پارٹی کا جلسہ تھا۔ اور اس جلسے کا عنوان تھا ''کشمیر کا صحافی اور نڈر رہنما شمیم احمد شمیمؔ'' جب ملک میں سیاسی بیداری کا احساس ہونے لگا تو لوگ جلسوں میں سینکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں شریک ہونے لگے۔ شمیم احمد شمیمؔ جب الیکشن مہیم کے سلسلے میں ایک جلسے سے دوسرے جلسے کی طرف جاتے تو نوجوانوں کی بھیڑ ان کی گاڑی کے تعاقب میں دوڑ پڑتی انہیں سننے کے لئے لوگ اتنے بے قرار رہتے کہ مائک پر جو مقرر ہوتا اس کو وہ بڑی بے دلی سے سنتے اور بار بار شمیم احمد کے بولنے کے بارے میں پوچھتے کہ شمیم صاحب کب بولیں گے۔

شمیم احمد شمیمؔ پیشہ ور مولوی قسم کے مقرروں میں سے نہیں تھے جو اپنی تقریروں میں مذہب اور قومیت کے نام پر زہر افشانی کرتے ہیں اور بھیڑ میں بیٹھی ناخواندہ اکثریت کے جذبات کو بھڑکانے کے لئے اچھی مثالیں دے کر تالیاں پٹواتے ہی اس کے برعکس شمیم احمد کو اپنے حاضرین کی تالیوں کی ضرورت نہیں تھی وہ چاہتے تھے کہ ان کی دلوں کی گہرایوں میں اپنی بات اتر جائے بس یہی ان کی فکر ہوتی تھی وہ محلاتی سیاست کی لطیفے بازی پر حقائق اور اعداد وشمار کو اوّلیت دیتے تھے وہ صحیح معنوں میں جمہوریت کی بقاء کے ایک زبردست سپاہی تھے۔ انہوں نے خود غرضی اور موقع پرستی کی سیاست سے اپنے بے داغ دامن کو کبھی بھی آلودہ نہیں ہونے دیا جس کا ایک جیتا جاگتا ثبوت شیخ محمد عبداللہ سے ان کے نظریاتی اختلاف بھی ہیں۔ 1972ء میں شیخ محمد عبداللہ اور اندرا گاندھی کی ریاست کشمیر کے کردار کے سلسلے میں جو طویل بات چیت ہوئی تھی اس کے روحِ رواں شمیم احمد شمیم ہی تھے لیکن شیخ صاحب کے اقتدار سنبھالنے کے بعد ان کی شمیم صاحب سے اَن بَن ہو گئی جس کے نتیجے میں انہیں صبر آزما معاشی آزمائشوں سے گزرنا پڑا اس کے باوجود ان کے قلم اور زبان کی نوک جیسے تھی ویسی رہی۔ اور وہ کند نہ ہو سکی جس کا کشمیر کے سیاسی حکمرانوں کو ہمیشہ دکھ رہے گا۔

شمیم احمد نے اپنی 45 سالہ مختصر زندگی میں ہی اپنی ذات میں ایک انجمن کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے اپنی تنگ دستی کے حالات میں بھی عزم و ہمت کے ساتھ تعلیم حاصل کی کشمیر کے محکمہ اطلاعات کے ماہناہ ''تعمیر'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ شمیم احمد شمیمؔ نے اس خشک سرکاری اطلاع نامے کو بہت جلد ایک متحرک ادبی مجلّہ بنا

دیاان کے قلم کی طاقت کو دیکھتے ہوئے انہیں ترقی دے کر پہلے کلچر آفیسر اور پھر فیلڈ آفیسر بنایا گیا اس کے بعد اقتدار کے ایوان میں کھلبلی سی مچی کہ اس نوجوان کی پرواز ان حدوں کو چھو رہی ہے جہاں شہتیر بھی جل جایا کرتے ہیں تب بخشی غلام محمد نے شمیم احمد شمیمؔ کو اپنے عتاب سے واقف کرایا اور پھر اس کے بعد انہوں ''آئینہ'' جاری کیا تھا۔

شمیم احمد شمیمؔ بے کسوں کی بے کسی کو بغاوت سیکھانا چاہتے تھے اور وہ مظلوم لوگوں کی مظلومیت کو آتش فشاں بنانا چاہتے تھے جس کے نتیجے میں ظالم جل کر راکھ ہو جائیں اور اس زمین سے ظلم کا نام ونشان مٹ جائے۔ آپ دراصل پیدائشی باغی تھے بغاوت ان کے رگ و پے میں بسی تھی، وہ بغاوت کرتے تھے ظلم سے، ناانصافی سے، رشوت سے اور قوم کے ساتھ ہونے والی ہر طرح کی زیادتی سے، اسی لئے وہ باغی تھے۔

شمیم احمد شمیمؔ 13 جولائی۔ 1979ء کو ممبئی ہسپتال اپنے دوست سیّد تصدق حسین صاحب کو ایک خط لکھتے ہیں۔ جس میں موت اور حیات کی جنگ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

ممبئی ہسپتال

13 جولائی 1969ء

ڈیر تصدق!

''میں بڑی بڑی طاقتور شخصیات سے لڑنے کے بعد اب ایک اور لڑائی لڑ رہا ہوں اس کا تعلق میری زندگی اور میری موت سے ہے دل کہتا ہے کہ اس جنگ میں بھی میری فتح ہو گی لیکن دل کا کیا کہنا۔

''دل ہی تو ہے نہ سنگ و خِشت۔''

آگے سید تصدق حسین صاحب لکھتے ہیں کہ یہ ہے وہ شمیم جو اس کے خط کے آئینے میں منعکس ہے۔ شائد شمیم کے لئے ہی ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان۔ ''ے

شمیم احمد شمیمؔ سے اپنے ناراض بھی ہوئے اور بے گانے بھی ناخوش، انہوں نے کبھی کسی کو مایوس کرنے کی کوشش

نہیں کی وہ بارش کی مانند تھے جب برسے تو سب پہ ان کے یہاں کوئی جانب داری کا تصوّر نہیں تھا۔'' آئینہ'' اس بات کی ایک ٹھوس ثبوت ہے۔''' آئینہ'' کی تحریریں آج بھی حکمرانوں کے لئے ایک بہت بڑا طنز ہے۔ کشمیر کی نسلیں شمیم احمد کی تحریروں کو ادب نہیں بلکہ کشمیر کا شہر آشوب کی جیتی جاگتی تاریخ سمجھ کر پڑھیں گی۔ شمیم احمد شمیمؔ سیاسی ہوتے ہوئے بھی باغی تھے جو تیز بارش کی طرح سیاست دانوں پر برستے تھے۔

شمیم احمد شمیمؔ نے جس انداز سے بیک وقت ایک صحافی، ادیب، قلمکار، اور سیاست دان کی حیثیت سے اپنا سکہ جمایا تھا اس پر قلم اٹھانا مشکل ہے۔ ان کی مختصر اور پر جلال زندگی نے جو خواب جو چھاپ اور نقش ڈالا ہے آج تقریباً 40 سال گزنے کے بعد بھی اس کا اثر زائل ہوتے دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ ایک موثر انداز سے نسل در نسل منتقل ہو رہا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں درجنوں صحافی گزرے ہیں۔ جن کا شمار کرنا بھی مشکل ہے۔ لیکن شمیم احمد شمیمؔ نے منفرد زندگی گزاری ہے اور اپنی زندگی کی دو دہائیوں میں وہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا جو اکثر لوگ زندگی کی آخری عمر میں مشکل سے حاصل کر پاتے ہیں۔ وہ صرف چالیس سال کی عمر میں ہی ہندوستان کی پارلیمنٹ کے ممبر بنے۔ اور ریاستی اسمبلی کے بھی رکن رہے ایک کامیاب صحافی اور ادیب کی حیثیت سے ایسے نقوش چھوڑے کہ جن کو آج بھی صحافت کی اعلیٰ اقداروں کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بہتر ادیب ہیں۔ جو مختلف سماجی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔

شمیم احمد شمیمؔ نے جس طرح کشمیر میں صحافت کی ایک نئی سمت متعین کی جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شمیم احمد شمیمؔ نے وہ راہیں اختیار کیں ہیں۔ جو راہیں مولانا ابوالکلام آزادؔ اور مولانا محمد علی جوہرؔ نے کی تھیں۔ شمیم احمد شمیمؔ بھی انہیں کے نقش قدم کے مسافر تھے۔ شمیم احمد جیسے صحافی کشمیر میں کیا ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا جس کے قلم کی قوّت سے حکومت کے اعلیٰ ایوان لرز اٹھے ہوں یا جس نے لوگوں کے ذہنوں کو ذرا بھی جھنجوڑنے کی کوشش کی ہو ان کی زندگی کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ انہوں نے بنیادی طور پر ایک صحافی کی حیثیت سے کام شروع کیا لیکن بعد میں ایک سیاسی کارکن اور سیاستدان کا زاویہ نظر اپنا کر بھی اپنے مقدّس علم کو جس طرح توازن میں رکھنے کا بارشک کام انہوں نے انجام دیا اس کی مثال تلاش کرنا نہایت مشکل ہے۔'' آئینہ نماء'' کی بارہ جلدیں اس بات کی دلیل ہے کہ شمیم نہ صرف ایک اچھے صحافی تھے بلکہ ان کی اردو زبان پر دسترس بھی صاف جھلکتی ہے۔ آج کل کے دور

میں بھی ریاست میں سینکڑوں ہزاروں صحافی ہیں جو بے باک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ بڑے بڑے اخلاقی اور قانونی درس دیتے ہیں لیکن وہ اس وقت اپنے ان بیانوں کی سرعام دھجیاں اڑاتے ہیں جب وہ معمولی سے معمولی مسئلہ کی زد میں آجاتے ہیں۔شمیم اگرچہ شیخ صاحب کے گرویدہ رہے لیکن وقت آنے پر انہوں نے اپنے قلم کو ان کے خلاف بھی بے باکی سے استعمال کیا تھا۔شمیم صاحب کے بارے میں پروفیسر خلیق انجم نے کہا تھا کہ ان کی شخصیت بہت متنازعہ تھی لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اگر وہ دوسروں کے بارے میں کھری اور سچی باتیں کہا کرتے تھے تو خود اپنے بارے میں بھی بات کرتے ہوئے وہ کوئی کسر باقی نہیں رکھتے تھے۔انہوں نے جو اپنے بارے میں خاکہ لکھا ہے اس کا آغاز اس طرح سے ہوتا ہے

''وہ بڑا بے ایمان ہے وہ ایک نمبر کا فراڈ ہے وہ باتوں کا سوداگر ہے وہ بڑا منہ پھٹ اور گستاخ ہے۔''

شمیم نے خود اعتراف کیا ہے کہ ان کے متعلق ایک ہی رائے پر قائم رہنا مشکل ہے۔مرحوم شیخ عبداللہ کی شخصیت پر لکھتے ہوئے انہوں نے ایک کامیاب سیاستدان ہونے کی رائے محفوظ رکھی ہے۔زندگی کے آخری معرکہ میں انہوں نے بہت ساری تکلیفیں اٹھائیں۔ان کا اخبار سرکاری اشتہارات سے محروم ہو گیا۔ان کو اور ان کے بچوں کو گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔شمیم احمد نے ایک الیکشن کی تقریر میں کہا تھا''میں جب مروں گا تو میرے پاس ایک کرایہ کا مکان اور زیادہ سے زیادہ ایک پرانی سائکل ہوگی۔'' مگر ان کی بات ضرورت سے زیادہ سچی ثابت ہوئی۔آخری دنوں میں تو کرائے کا مکان بھی نہ تھا۔ وہ موت سے پہلے دو برس سے تقریباً اپنے بال بچوں سمیت اپنے بہنوئی کے ہاں رہ رہے تھے لیکن اپنی کسی بھی جنگ میں وہ آخری دم تک نہیں ہارے اس کی فتح اس طرح ہوئی کہ وہ ٹوٹ گیا مگر جھکا نہیں اس نے زمانے کی ہر ضرب خوشی خوشی برداشت کی دراصل یہی بات ان کے اعلیٰ ظرف ہونے کی دلیل ہے۔ انسان کو اس کی زندگی کے برسوں سے نہیں ماپا جاتا نہ ہی اس کے مکان ودکان اور دولت سے ناپا جاتا ہے بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس نے دوسروں کو کیا اور کتنا دیا اس نے زندگی میں دوسروں کے لئے کیا کیا۔

یہ کہنا بھی غلط ہی ہوگا کہ شمیم احمد شمیمؔ کی موت قبل از وقت ہوئی انہوں نے اپنی 45 برس کی مختصر زندگی میں وہ سب کچھ کر دکھایا جو ایک کامیاب آدمی اپنی عمر کے 90 برس میں مشکل سے کر پاتا ہے۔انہوں نے خاصی اچھی تعلیم حاصل کی۔وکالت کا امتحان پاس کیا کم عمری میں ہی ریاست میں ماہنامہ ''تعمیر'' کے اڈیٹر بنے'' آئینہ'' کی 16

سال خدمت کی اور دنیاں کو بتایا کہ صحافت اور ادب کس کو کہتے ہیں وہ ایم۔ایل۔اے۔ بنے اور پھر ایم۔ پی۔ بنے اس کے بعد ''آئینہ'' کو ہفت روزہ سے روزنامے میں تبدیل کیا۔ پارلیمنٹ کے بہترین اردو مقرر رہے وہ فصاحت، خطابت اور انداز بیاں کا بادشاہ رہے۔ وہ کبھی روایتی طرز فکر کے حامل نہیں بنے ان کی فکر آزاد تھی اور اسی طرح اس کی بے باکی بھی اس کی ایک صفت تھی۔ ایمرجنسی میں بھی وہ شمیم احمد شمیمؔ ہی تھے جس نے بھری پارلیمنٹ میں اس کے خلاف آواز اٹھائی وہ اپنی دانست میں جس بات کو صحیح سمجھتے تھے اس کے لئے اپنے عزیز ترین دوست سے بھی اپنے اختلاف کا اظہار دوٹوک کرتے تھے۔ ایمرجنسی کے نفاذ پر اور ختم ہونے پر ان کے دو دوستوں نے ''گگن'' میں ایمرجنسی کے حق میں لکھا۔ تو شمیم احمد شمیمؔ سے رہا نہ گیا اور ان کے نام خط لکھ کر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ ممبئ میں میرے دو ہی دوست تھے ایک خشونت سنگھ دوسرا شمس کنول میری طرف سے اب یہ دونوں ہی مر گئے۔

شمیم احمد شمیمؔ کسی مخصوص سیاسی عزم کا پابند نہیں تھے کسی کا پابند ہونا ان کے مزاج کے خلاف تھا اگر چہ وہ سیکولر مزاج کے حامل ضرور تھے تاہم انہوں نے اپنے ہم وطن کشمیریوں کی فلاح کے لئے بہت لکھا اور بہت کچھ کہا لیکن وہ سچّے قوم پرست تھے ان کی مادری زبان کشمیری تھی اس کے باوجود انہوں نے اردو زبان کی وکالت ہندوستان کے ہر علاقے میں پہنچ کر کی، وہ ہر طرح کے تعصب اور فرقے سے پاک تھے اور ہر علاقے کے انسان اس کے دوست تھے وہ دور رہ کر بھی اپنے دوستوں کے کام آتا تھے وہ گھر ہو یا باہر تواضع کرنے میں وہی پہل کرتے تھے دراصل ان کی پختہ اور بالغ شخصیت کے پیچھے سماجی شعور اور زندگی کی سچائیاں چھپی ہوئی تھیں۔ وہ بتاتے تھے کہ انہیں سچائی سے پیار ہے۔

ریاست جموں وکشمیر سے باہر بھی شمیم احمد شمیمؔ کی شخصیت کو پر وقار اور شاندار پزیرائی کا وصف حاصل ہوا۔ اور اس تعریف کا حسن اور دوبالا ہو گیا جب شمیم احمد کی معنی خیز تقاریروں نے سارے شمالی ہندوستان کی توجہ ان کی طرف مبذول کی، انہی دِنوں خشونت سنگھ نے کہا تھا، لوک سبھا میں سب سے اچھی ہندی اٹل بہاری واجپائی، سب سے بہتر انگریزی پیلو مودی اور سب سے بہتر اردو اسپیکر شمیم احمد شمیمؔ تھے۔

شمیم صاحب کی سب سے بڑی کمزوری ہ تھی کہ وہ اپنے مخالف کو نیچا دکھانے میں کسی بھی حد تک جانے کے لئے فوراً کمر بستہ ہو جاتے اور خودسری کا یہ عالم تھا کہ کئی احباب کو اس کے دشمنوں میں تبدیل کرنے کا باعث بن

گیا لیکن اگر وقت پہ ضرورت پڑتی تو دشمن کے بھی کام آجاتے گرچہ وہ جانی دشمن ہی کیوں نہ ہو۔کرشن چندر اپنے مضمون میں شمیم احمد شمیم کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''میں حتی الامکان آئینہ دیکھنے سے گریز کرتا ہوں لیکن شمیم احمد شمیم نے جو''قدم آدم'' آئینہ ایجاد کیا ہے اسے دیکھنے کی خواہش سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔شمیم احمد شمیمؔ ایک نوجوان جرنلسٹ ہیں ایک باشعور سیاسی رکن ہیں ایک کج بحث اور ذہین وکیل ہیں ایک عمدہ ادیب اور بے انتہا طبّاع انسان ہیں اتنی چیزیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو شخصیت میں ایک آنچ کی کمی بھی نہیں رہ جاتی ہے۔شمیم کی تحریر دیکھنے سے پہلے میں ان کی تقریر سن چکا تھا اور بڑے نازک وقت میں تقریر سن چکا تھا۔ممبئی میں اردو کنونشن کے موقع پر ہوم منسٹر شری کوچوان کی موجودگی میں جناب شمیم نے جو دھواں دار تقریر فرمائی تھی اور جس صاف گوئی سے اردو کے سلسلے میں ہونے والی سیاسی دھاندلیوں کا پردہ چاک کیا تھا اور جس تقریر کی چنگاریاں صرف حکومت ہند پر نہیں مجھ خاکسار پر بھی بکھر رہی تھیں یہی وہ شعلہ بیانی تھی یا تقریر کا جادو تھا کہ کوئی گالیاں کھا کر بے مزا نہ ہوا''۔ ۸

کوئی بھی بالغ نظر شخص باوجود اختلاف کے شمیم احمد شمیم کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔وجہ یہ کہ وہ ایک محض کالم نگار صحافی نہیں تھے۔محض ایک سیاست کار نہیں تھے۔بلکہ تر و تازہ خیالات اور دانشورانہ فکر کا حامل ایک ادیب تھے۔انہیں اپنی شخصیت کا لوہا منوانا آتا تھا جیسی تقریر تھی ویسی تحریر بھی۔اور فکر دانشورانہ تھی ان کی دانشورانہ فکر کی مثال ہمیں ان کے لکھے ہوئے ایک مضمون جو کہ انہوں نے سن 1975ء میں لکھا تھا ملتی ہے۔

''تقسیم ہند کے مابعد اثرات''۔

''ہندوستانی مسلمان کا مستقبل کیا ہے،اسے کیا کرنا چاہئے۔اور کیا نہیں

کرنا چاہئے؟۔ وہ سوالات ہیں جن کا قطعیت کے ساتھ جواب دینا ممکن نہیں لیکن ایک بات طے ہے کہ ہندوستانی مسلمان کا مستقبل خود ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہے اگر ہمارا ملک تعلیمی پسماندگی، ذہنی پستی، اقتصادی بدحالی، اور سیاسی افراتفری کے اس اندھیرے سے باہر نکل کے آگے بڑھنے میں کامیاب ہوا تو ہندوستان کا مسلمان بھی خوش حال اور آسودہ ہوگا۔ کیوں کہ نئے ہندوستان میں مذہب تعصب اور فرقہ وارانہ نفرت کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ اس کے برعکس اگر ہندوستان کی سیاسی قیادت اقتصادی محاز پر ناکام ہوکر اس ملک سے بھوک، غربت، افلاس، اور لاچاری مٹانے میں کامیاب نہ ہوسکی تو پچپن کروڑ ہندوئں کے ساتھ چھ ساتھ کروڑ مسلمان بھی ڈوب جائیں گے اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل گہرے طور پر اس ملک کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ انہیں کیا نہیں کرنا چاہے میں نہیں کہ سکتا ہوں۔ انہیں کسی بھی قیمت پر کسی فرقہ پرست جماعت کا آلہ کار نہیں بننا چاہیے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے فرقہ پرست سیاست خودکشی کے مترادف ہے، اور اسلام میں خودکشی گناہ عظیم ہے۔'' 9

شمیم احمد شمیم روایتی معنوں میں وہ مذہبی آدمی نہیں تھے اور وہ رسمی مذہب کا قائل بھی نہیں تھے کیوں کہ وہ رسوم اور رواج کے خلاف بڑی شدّت سے بولتے تھے۔ رسول اکرام ﷺ نے اپنے دور کے سب سے ذہین شاعر ابن الصلت کے بارے میں فرمایا تھا۔ اس کا قلب مومن ہے مگر اس کی زبان کافر ہے اسی طرح شمیم احمد کی روح میں بھی ایمان تھا لیکن مذہب کے ٹھیکیداروں اور خدائی فوجداروں کے دشمن تھے۔ تخریب کاری، گروہ بندی، فرقہ بندی، رسم ورسوم وغیرہ کے اختلافات کے سخت مخالف تھے۔ ان لوگوں کے خلاف شمیم احمد کی زبان اور قلم دونوں شمشیر بن کر چلتے تھے اور ظاہر میں لوگوں کو ان پر شک ہوتا تھا اور وہی مذہب کے ٹھیکیدار فتویٰ لگانے میں دیر نہیں

کرتے تھے ان حضرات نے تو اقبالؔ رحمت اللہ علیہ کو بھی نہیں بخشا۔اقبالؔ نے جب پہلی بار سن 1911ء میں شکوہ لکھا تو اقبالؔ رحمت اللہ علیہ پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا لیکن جب جواب شکوہ لکھا گیا تو اپنے فتویٰ پر شرمندہ ہوئے ان کم ظرف اور کم علم بے صبر لوگوں سے شمیم احمد کو سخت نفرت تھی۔شمیم احمد خود اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں:۔

''میں نے خدا کے وجود اور اس کی بے پناہ لامحدود اور حیرت ناک قوّت سے کبھی انکار نہیں کیا ہے۔اس دور میں بھی جب ایسا کرنا فیشن میں شامل تھا۔میرے لئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا میں نے بچپن سے ہی ایسے مظاہر دیکھے تھے۔ان کو دیکھ کر اس کے وجود سے انکار کرنا اپنے وجود سے انکار کرنے کے مترادف تھا۔میں نے اپنی آنکھوں سے اس کے معجزے دیکھے ہیں اور آج میں خود اپنے حق میں اس کے ایک معجزے کا منتظر ہوں۔دیکھیے میرے مقدر میں کیا ہے مجھے امید واثق ہے کہ آپ اپنی دعاؤں میں مجھے اس طرح یاد کرتے ہوں گے جس طرح ایک باپ اپنے بیٹے کو ابتلا میں دیکھ کر کرتا ہے۔آپکا مخلص شمیم۔''

۱۰ے

سیاسی شمیم،صحافی شمیم،ادیب شمیم،مقرر شمیم،دانشور شمیم،مجاہد شمیم،وکیل شمیم،نڈر شمیم،انہیں کس نام سے پکارا جائے ہر طرف وہ اپنی چھاپ چھوڑ گئے ہیں وہ نوجوانوں کی دلوں کی دھڑکن تھے،وہ ایک ستارہ تھے۔جس کے بغیر یہ آسمان ویران لگتا ہے کیوں شمیم احمد شمیمؔ کے بعد کوئی شمیم احمد پیدا نہیں ہوا۔

آج کی ریاست اور سیاست دونوں کو دیکھ کر رونا آتا ہے کہ انہوں نے کس طرح اپنے سیاسی مفاد کی خاطر ایک قوم کے حال اور مستقبل کو کس طرح برباد کیا جا رہا ہے آج ہم کو ہی کاٹا جا رہا ہے ہم کو ہی مارا جا رہا ہے ہم کو ہی ڈھال کے طور استعمال کیا جا رہا ہے۔ہمارے ہی بچوں کی انکھیں اندھی کر دی گیئں ہیں ہمارے ہی جوانوں سے قید خانے بھرے ہوئے ہیں۔ہماری ہی ماؤں بہنوں کی عزت لوٹی جا رہی ہے اور ہم کو ہی مجرم،غدّار،اور پاکستانی کہا جاتا ہے

آخر کیوں کوئی شمیم احمد شمیمؔ پیدا نہیں ہوتا جو پارلیمنٹ میں ہمارے حقوق کی بات کرے ہمارے ظلم وستم کے دردو کرب کو بیان کرے ہماری ماؤں بہنوں کے چھینے ہوئے ڈوپٹے واپس دلائے آج شمیم احمد شمیمؔ ہوتے تو اپنی آواز کو ضرور بلند کرتے لیکن قدرت نے اسے موقع ہی نہ دیا اور جوانی میں ہی واپس بلا لیا دراصل یہ دنیا ظلم وزیادتی ،اورلٹیروں اور درندہ انسانوں کی دنیا ہے۔ یہاں شمیم احمد شمیمؔ کو رکھنا قدرت کو پسند نہ آیا،اور یکم مئی 1980ء میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے واپس بلا لیا۔صدیوں سے اس قوم کو انتظار ہے کہ کوئی شمیم پیدا ہو لیکن یہ انتظار شائد قیامت تک رہے گا۔

شمیم احمد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرنے کے لئے راقم نے ایڈوکیٹ ظفر معراج سے ملاقات کی،جن کی زندگی کا بیشتر حصہ شمیم احمد شمیمؔ کے ساتھ گزرا ہے جو کہ شمیم صاحب کے بھانجے ہیں ان سے شمیم احمد شمیمؔ کی شخصیت اور زندگی کے متعلق کئی ایک سوالات کئے یہاں ان سے لیا گیا انٹرویو شامل کیا جاتا ہے،تاکہ شمیم احمد شمیمؔ کی زندگی کے تمام پہلو روشن ہوسکیں۔

****

حوالہ جات۔

۱۔ ہفتہ وار آئینہ، 7 جولائی 1974ء شمارہ نمبر ۳۷۸

۲۔ ہفتہ واری آئینہ 30 جون 1972ء، مشمولہ، شیرازہ (شمیم احمد شمیم نمبر) کلچرا کیڈمی جموں و کشمیر، ص ۲۹۸

۳۔ ہفتہ واری آئینہ 30 جون 1972ء، مشمولہ، شیرازہ (شمیم احمد شمیم نمبر) کلچرا کیڈمی جموں و کشمیر، ص ۳۱۵

۴ ڈاکٹر وحید، لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچاں، مشمولہ۔ شیرازہ ، (شمیم احمد شمیم نمبر) کلچرا کیڈمی جموں و کشمیر، ص ۹۶۔

۵۔ ڈاکٹر وحید۔ مضمون لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچاں،، شیرازہ (شمیم احمد شمیم نمبر) جموں اینڈ اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر،۔ ص ۱۰۰

۶۔ پروفیسر رحمان راہی (مضمون) دعا اقبال کی تاثیر۔ مشمولہ۔، شیرازہ (شمیم احمد شمیم نمبر) جموں اینڈ اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر، ص ۱۱۱۔

۷۔ سیّد تصدق حسین، (مضمون) پیدائشی باغی، مشمولہ۔ شیرازہ (شمیم احمد شمیم نمبر) جموں اینڈ اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر، ص۔ ۱۲۹۔

۸ کرشن چندر، (مضمون) چھٹتا نہیں ہے منہ سے کافر لگا ہوا۔ مشمولہ۔ شیرازہ (شمیم احمد شمیم نمبر) جموں اینڈ اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر، ص ۲۲۳۔

۹۔ قراۃ العین، آئینہ نماء (باغاتِ برزلہ نزد بون اینڈ جوائنٹ ہسپتال، برزلہ، سرینگر کشمیر۔ جلد۔ چہارم، ۲۰۰۴ء ص ۷۴

۱۰۔ میر غلام رسول نازکی۔ (مضمون)، سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں، مشمولہ، شیرازہ (شمیم احمد شمیم نمبر) جموں اینڈ اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر، ص۔ ۲۹۶۔

****

انٹرویو

ایڈوکیٹ ظفر معراج صاحب سے ایک ملاقات

ایڈوکیٹ ظفر معراج صاحب سے ایک ملاقات۔

(اس انٹرویو سے شمیم احمد شمیم کی زندگی سے متعلق اہم معلومات حاصل کی گئی ہیں)

جناب ظفر صاحب آپکا بہت بہت ممنون ہوں جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آج ہم ایک تحقیقی موضوع پر بحث کرنے والے ہیں ایک ایسی شخصیت جس سے نہ صرف ریاست جموں وکشمیر متاثر رہی بلکہ پورا ملک ان کا مدّاح تھا۔خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ مجھے اس اہم شخصیت پر تحقیقی کام کرنے کا موقع ملا ہے۔

جی ظفر صاحب اس سلسلے میں آپ سے سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ

سوال:۔شمیم احمد شمیم صاحب کی ابتدائی زندگی کے متعلق اپنی جانکاری کا اظہار کریں نیز ان کی ذاتی زندگی کے حالات اور واقعات پر بھی روشنی ڈالیں۔؟

جواب:۔دیکھئے شمیم صاحب کا جو خاندانی تعلق ہے وہ ایک پڑھے لکھے گھرانے سے ہے۔ان کے والد صاحب ان کے چچا اور بالخصوص ان کے داد جان جو تھے ان کا نام مولوی عبداللہ تھا وہ اس زمانے میں وکیل ہوا کرتے تھے جب کہ ان کے پاس قانون کی ڈگری نہیں تھی ایک الگ سی ڈگری تھی جو اس زمانے میں رائج تھی ان کا کشمیر کی تاریخ میں ایک اہم نام ہے وہ اپنے دور میں راجہ مہاراجہ کے خلاف تھے اور تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیخ عبداللہ کے استاد تھے۔انہوں نے شیخ عبداللہ کی شعوری پرورش کی تھی اور سیاسی ذہن اور سیاسی خیالات ان ہی کی مرہون منت ہے شیخ عبداللہ ان کے ہی طفل مکتب تھے۔شمیم صاحب کے والد صاحب ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے وہ ایک تاجر تھے۔ضلع شوپیان کے علاقہ ناصور میں دکانداری کیا کرتے تھے۔

شمیم صاحب کو بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا اور ساتھ ہی ساتھ خطابت بھی ان کا ایک اہم مشغلہ رہا ہے۔ اور ہمیشہ انہوں نے اسکول،کالج، یونیورسٹی میں زور خطابت کا لوہا منوایا۔ اس کے علاوہ ان کو ادب صحافت،سماجیات،لوگوں کو درپیش مسائل اور معاشیات سے اچھا خاصا تعلق رہا ہے وہ کوئی امیر گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے تھے اس کے باوجود انہوں نے ایس پی کالج سے اپنی تعلیم مکمل کی اور ان ہی دنوں سری نگر سے ایک میگزین نکلا کرتا تھا''پرتاب'' کے نام سے اس کے ایڈیٹر منتخب ہوئے میں اس زمانے کی بات کرر ہا ہوں جب

میگزین کا اڈیٹر بننے کے لئے بہت بڑی کوالیفکیشن ہونی چاہے تھی اور ساتھ ہی ساتھ شمیم صاحب میں وہ کولیٹیز بھی موجود تھیں جو ایک اڈیٹر میں ہونی چاہئے تھیں۔اور کمسنی کے زمانے میں ہی ایک مضمون لکھا جس پر کافی زیادہ بحث و مباحثہ ہوئے ،ادبی انجمنوں میں ایک بھونچال آ گیا تھا اس میں غالب کی شاعری پر کچھ سوالات اٹھائے تھے۔اور غالب کے خلاف لکھا تھا جو کہ ایک متنارہ مضمون ہو گیا تھا۔لیکن وہ اپنی بات پہ ڈٹے رہے۔اور کہا مجھے یہ یہ نقص نظر آ رہے ہیں۔اس کے بعد انہوں نے سرکاری مالازمت اختیار کی ماہنامہ تعمیر جو کہ محکمہ اطلاعات کی نظر ثانی میں چل رہا تھا۔بعد میں شمیم صاحب کو اسی محکمے میں آفیسر بنایا گیا تھا۔اور تعمیر کا مقام اس زمانے میں نہایت ہی بلند تھا۔لیکن شمیم صاحب کی طبیعت ہمیشہ سے ہی اتھل پتھل رہی۔اور ایک جگہ رہنے شوقین نہیں تھے۔اور مازمت محظ حصول معاش کے لئے کی۔جبکہ ان کو ملازمت میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ملازمت میں کام کرنے کے بعد زیادہ تر وقت کافی ہاؤس میں گزارتے تھے۔اس زمانے کے سارے ادیب مصوّر شاعر زیادہ تر کافی ہاؤس میں ہی ہوتے تھے۔

اسی دوران بخشی صاحب نے دفتروں کی حاضری لی اور شمیم صاحب کو غیر حاضر پایا اور پتا چلا کہ کافی ہاوس میں ہیں۔اور سسپنڈ کیا گیا۔یہ ان کی زندگی کا ایک نیا موڑ تھا اور انہوں نے نوکری چھوڑ دی اور علی گڑھ چلے گئے۔علی گڑھ سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔لیکن اس دوران انہوں نے آئینہ کی شروعات بھی کی۔پہلے ہی شمارے سے آئینہ بہت مقبول ہوا۔اسی عرصہ میں شمیم صاحب علی گڑھ آ گئے اور یہیں سے آئینہ کے لئے لکھتے رہے۔آئینہ شمیم احمد شمیم صاحب کی ذات تھا۔1 صفحے سے 8 صفحے تک شمیم صاحب کے قلم سے ہوا کرتا تھا۔مختلف ناموں سے سے کبھی چراغ بیگ۔کبھی زاردار بی اے کبھی عباس رکھا۔سیاست کے کالم کا الگ نام تھا۔طنز و مزاح کا چراغ بیگ رکھا تھا۔جو تیسرے صفحے میں ہوتا تھا اور اخبار کی ریاست اور بیرون ریاست بہت پزیرائی ہوئی پہلی بار جب انہوں نے الیکشن لڑا تو اس دور میں الیکشن میں بہت دھاندلی ہوا کرتی تھی ان کے مقابلے میں غلام حسن خان کانگرس کی جماعت سے تھے سرکار کی تمام کوششوں کے باوجود شمیم صاحب الیکشن جیت گئے اس کے بعد انہوں نے سفرنامے لکھے پاکستان میں چالیس دن، کابل میں دس دن، اسی طرح ''آئینہ'' چلتا رہا۔

سال :۔شمیم صاحب کی ازدواجی زندگی کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے۔اور یہ زندگی کس حالت میں گزری۔ان کے خاندان میں کتنے لوگ شامل تھے۔؟۔

جواب۔ان کی ازدواجی زندگی 61 - 1960ء سے شروع ہوتی ہے اور انکی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا آدم ،ہے۔ماشاللہ تینوں اچھے خاصے اپنی اپنی جگہ آباد ہیں بیٹے ان کی آج کل اپنی فیملی کے ساتھ دبئ میں ہیں۔بیٹی ایک بھوپال میں ایک کراچی میں ایک دہلی میں ہے پانچ بہنیں ہیں ایک جو میری والدہ تھیں ان کا انتقال ہو چکا ہے۔باقی چار الحمدللہ حیات ہیں قرات العین سب سے چھوٹی بہن ہے جس نے یہ ''آئینہ'' کے شماروں کا بیڑا لیا ہے اور ان کو ہر سال شائع کرر ہیں۔

سوال:۔شمیم صاحب کے دور کے نمایاں صحافی کون لوگ تھے اور موصوف نے خود صحافت میں قدم رکھا۔اور صحافت میں آنے کے اسباب ومحرکات کیا تھے۔؟۔

جواب:۔ دراصل ان کے خاندان کا شروع سے ہی صحافت سے تعلق رہا ہے۔ان کے ایک چچا ہوا کرتے تھے۔ان کا نام۔محمد ایوّب تھا وہ ایک صحافی تھے وہ مہاراجہ ہری سنگھ کے زمانے میں جب کہ شخصی راج تھا انہوں نے ''صداقت'' اور دوسرا ''حقیقت'' نام سے اخبارات نکالے تھے اور وہیں سے شمیم صاحب کو بھی صحافت کا درس ملا اور دادا جان سے انہیں سیاست کا درس ملا ان کے داد جان سیاست کے بارے میں بہت اچھا شعور رکھتے تھے۔وہیں سے شمیم صاحب نے سیاست کو قبول کیا۔

سوال۔نمبر۴۔صحافت سے سیاست تک کا سفر کیسے کیا؟۔اور اخبار ''آئینہ'' کا مقصد صرف سیاسی تھا، یا سماجی ومعاشی تھا۔رہبری فرمائیں۔؟

جواب۔بنیادی طور پر ''آئینہ'' کا جو مقصد تھا وہ سماجی تھا۔سماج جو برائیاں تھی۔انکو بہتر کرنا ''آئینہ'' کا مقصد تھا اور جو کچھ معاشرے میں ہو رہا ہے اس کی اصلاح کے لئے۔لیکن سیاست بھی ساتھ ساتھ تھی کیوں کہ کشمیر میں سیاست اور صحافت میں زیادہ فرق نہیں ہے ایک طرف سیاست بھی نہایت ہی اہم تھی اور وہیں صحافت بھی اہم تھی۔

پالیمنٹ کے دوران بھی ان کا رول بہت ہی یادگار رہا ہے۔خشونت سنگھ نے ایک تحقیقی رپورٹ تیار کی کہ پارلیمنٹ میں کیا ہو رہا ہے اس رپورٹ میں وہ لکھتے ہیں کہ پارلیمنٹ میں تین لوگ جو ہیں وہ اعلیٰ پائیہ کے مقرر اور سنجیدگی سے سننے والے ہیں ان میں اٹل بہاری واجپائی، ہندی میں پیلو مودی انگریزی میں، اور شمیم احمد شمیم

اردو میں۔

سوال:۔شمیم صاحب کی زندگی کا کوئی متاثر کن واقع یاد ہو تو ہمیں سنا دیں؟۔

جواب۔ایک واقعہ میں آپ کو سنا دوں کہ اندرا گاندھی جی کے وہ سخت خلاف تھے۔ایمر جنسی کے دور کی ان کی تقریریں سننے لائق ہیں لیکن اس سے پہلے جب بنگلہ دیش کا واقع ہوا پارلیمنٹ میں تقریریں ہو رہی تھیں اور شمیم صاحب نے اپنی تقریر میں ایک جملہ کہا اور پورے ایوان کو لوٹ لیا انہوں نے کہا کہ میڈم

''دنیا میں آج تک سیاست دانوں نے تاریخیں بدلیں ہیں لیکن آپ پہلی خاتون وزیر اعظم ہیں جس نے دنیاں کا جغرافیہ بدل دیا ہے''۔

اور ایک نئے ملک کو نقشے میں لایا ہے لیکن بعد میں وہ ایمر جنسی کے دوران میڈم اندا گاندھی کے خلاف ہو گئے تھے۔

سوال:۔سیاست تو ایک بوجھل عمل ہے۔اس میں قدم رکھنے کے بعد انسان کسی دوسرے شعبے میں یکسوئی سے کام نہیں کر پاتا۔کیا شمیم صاحب کی سیاسی زندگی نے ان کی صحافتی یا ذاتی زندگی کو متاثر کیا؟۔

جواب۔پارلیمنٹ میں وہ جب چلے گئے تو اس سے ان کی صحافت پر تھوڑا اثر پڑا۔صحافت انکی ضرور قائم رہی لیکن جس تندہی اور کثرت سے لکھا کرتے تھے ویسے نہیں رہا چونکہ پارلیمنٹ میں زمہ داریاں بڑھ گئیں،تاہم وہ لکھتے رہے اور ان کی یہی کوشش رہی کہ جو وقت ملے اس میں لکھا جائے۔

سوال نمبرے۔آپ کو موصوف کے ساتھ کتنا عرصہ کام کرنے کا موقع ملا اور اپکا اور ان کا آپس میں کیا رشتہ تھا اور کن موضوعات پر بحث ہوا کرتی تھی؟۔

جواب۔شمیم اور میں آپس میں ماما بھانجہ تھے وہ میرے ماما تھے اور انہوں نے مجھے گود لیا تھا اس لئے زندگی کا بہت سار وقت ان کے ساتھ بِتایا ہے ان سے ہر طرح کے موضوعات پر بحث ہو جاتی تھی کبھی سماجی کبھی سیاسی لیکن زیادہ تر سیاسی گفتگو ہوا کرتی تھی اور وہ کشمیر کو ایک بڑی باشعور نظر سے دیکھتے تھے وہ کشمیر کو ان تمام برائیوں اور سیاسی حالات کے بحران سے باہر نکالنا چاہتے تھے اور یہ سوال تو بہت لمبا ہو جائے گا لہٰذا پھر کبھی وقت ملے تو بات ہو گی۔

سوال:۔شمیم صاحب کی کل کتنی تصانیف ہیں۔

جواب۔شمیم صاحب کی کوئی تصنیف نہیں ہے انہوں نے جولکھا وہ بس اخباروں میں لکھا ہے۔

سوال نمبر۹ ۔شیخ محمد عبداللہ سے شمیم صاحب کے کیا مراسم تھے؟۔

جواب ۔ابتداء میں شمیم صاحب اور شیخ صاحب کے مراسم بہت اچھے تھے لیکن بعد میں دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے شیخ صاحب زرا اونچی نظر رکھتے تھے۔اور دوسروں کو زرا کم ہی ترجیح دیتے تھے اور شمیم صاحب کی طبیعت بھی کسی کے سامنے جھکنے کی نہیں تھی جس کی وجہ سے تعلقات نہ قائم رہ سکے۔

سوال۔نمبر۱۰۔شمیم صاحب کا شوپیان سے سرینگر اور پھر سرینگر سے دہلی تک کا سیاسی وصحافتی سفر کیسا رہا؟ اور کن حالات کا سامنا کرنا پڑا۔اور کونسی پارٹی سے شمیم پارلیمنٹ پہنچے تھے؟۔

جواب۔ شمیم پہلے ''تعمیر'' سے جڑے پھر'' آئینہ'' سے باقاعدہ صحافتی سفر شروع ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ سیاسی بھی۔پھر علی گڑھ میں وکالت کی تعلیم جس سے سیاسی شعور اور بھی زیادہ پختہ ہو گیا پھر پارلیمنٹ کے جانے مانے مقرروں میں شمیم نے اپنا نام داخل کیا رہی بات مسائل کی تو مسائل تو بہت سارے درپیش آئے حکومت ان کو پارلیمنٹ میں جانے سے بہت روکنے کی کوشش کی دھاندلی کرنے کی بہت کوشش کی لیکن خود الیکشن کمیشن نے جب اپنی نگرانی میں الیکشن کروایا تو شمیم صاحب کامیاب ہوگئے جہاں ان کے بہت زیادہ دوست تھے وہیں دشمن بھی بہت تھے جو اس گرجتی آواز کو بند کرنا چاہتے تھے شمیم پارلیمنٹ میں آزاد امیدوار تھے۔

سوال نمبر ۱۱۔شمیم صاحب کا انتقال کم عمری میں ہی ہو گیا۔اس کی کیا وجوہات رہیں۔؟

جواب۔ہوا یہ کہ 1978ء میں ان کو آنکھ میں تکلیف تھی۔اور اس کا علاج کروانے پہلے ممبئ اور بعد میں لندن چلے گئے وہاں آنکھ کا آپریشن ہوا جو کہ فیل ہو گیا اور وہیں سے ان کو جگر میں کوئی بیماری ہو گئی جو بعد میں کینسر کی صورت اختیار کرگئی۔اس کے بعد امریکہ گئے۔لیکن اس بیماری نے آخری دم تک نہیں چھوڑا۔اور 1 مئی 1980ء میں انتقال کر گئے۔

سوال :۔آخری سوال یہ کہ ان کی موت کے بعد آپ نے ان کی میراث یعنی جو کچھ انہوں نے صحافت کے حوالے سے لکھا اس کا تحفظ کیسے کر رہے ہیں۔؟

جواب :۔ان کی اس میراث کو نہ صرف ہم نے بلکہ ان کے چاہنے والے تمام احباب نے ،ان کے دوستوں

نے ،محفوظ کیا ہے لیکن اس سب کے باوجود جو شمیم صاحب کی سب سے چھوٹی بہن ہیں، قراۃ العین، وہ تقریباً 12 سال سے لگا تار شمیم صاحب کی تحریروں کو جو کہ آئینہ کے شماروں میں تھیں ۔ان کو یک جا کر کے ہر سال ایک جلد شائع کر رہی ہیں ابھی تک الحمداللہ 13 جلدیں منظرعام پر آچکی ہیں اور باقی کام زیر ترتیب ہے انشاللہ وہ بھی شائع کیا جائے گا۔

ایڈوکیٹ ظفر اقبال صاحب آپ نے ہم کو شمیم احمد شمیمؔ کے بارے میں بہت ہی اہم معلومات فراہم کیں آپ کا بہت شکریہ۔

دسمبر 2018 بمقام جموں دربار، رستوران۔چھنی سٹیڈ موڑ جموں کشمیر۔

****

باب سوم

شمیم احمد شمیم : بحیثیت صحافی

ہفت روزہ آئینہ ۱۹۶۸ء کا پہلا صفحہ۔

ANCHOR

آئینہ

انتخابات میں نیشنل کانفرنس کی بھاری کامیابی سے الحاق کے فیصلہ کو عوامی تائید کی مہر ثبت ہو گئی

مجھے یقین ہے کہ بھٹو کو قتل کے الزام میں عدالت قصوروار ٹھہرائے گی

PHILIPS

خوش آمدید

Subhana Tailor

THE BUND, SRINAGAR.

FOR EXCLUSIVE CLOTHINGS

STOCKISTS OF

روزنامہ آئینہ، ۱۹۷۷ء، کے شمارے کا پہلا صفحہ۔

Regd No - K-5 The DAILY AAINA SRINAGAR

جنرل ضیاء کا بیان

سیب پیک کرتے تیار ہو رہے ہیں
مگر ذرا ٹھہریے

جب بھی خریدیں
بہترین ہی خریدیں

فلپس خریدیں

فلپس

AUTHORISED PHILIPS DEALERS

AEROSOUND, LAL CHOWK SRINAGAR

پرانی فرم

این ڈی رادھا کشن

روزنامہ آئینہ، ۱۹۷۷ء کے شمارے کا آخری صفحہ

Regd No - K-5 The DAILY AAINA

جب بھی خریدیں
بہترین ہی خریدیں

فلپس

کشمیر ٹین
پرانی فرم
این ڈی رادھا کشن

ہفت روزہ آئینہ ۱۹۶۸ء کا ایک کالم۔

کھلی چٹھی

سرکاری افسروں کے نام

(وہ جن کا تعلق انتخاب سے ہے)

پیارے سرکاری افسرو!

۱۶ فروری کی تاریخ قریب آ رہی ہے۔ تاریخ کے سینے میں مستقبل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ نظام کہن ایک آخری کروٹ بدل کر موت کی نیند سو جائیگا اور ۲۲ فروری کی صبح اپنی گود میں ایک نئے دور کو لئے طلوع ہوگی۔ بیس برس کی کلفتیں امید اور یقین کی حرارت سے پگھل کر بہہ جائیں گی، اور ان کے ساتھ ہی تمہارے دلوں کا میل اور ہماری ختیوں کا کھوٹ بھی دھل جائیگا۔ نئے اور پرانے دور کے درمیان اب صرف چند دنوں بلکہ کچھ گھنٹوں کا فاصلہ ہے اور تم لوگوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تم اس تاریخی کشمکش میں ماضی کا ساتھ دو گے یا مستقبل کا ہاتھ تھامو گے؟

[illegible]

(باقی صفحہ ...)

علاقہ شوپیاں کے رائے دہندگاں کے نام

میرے ہم سفرو!

گزشتہ دو ماہ سے تم نے میری راہوں میں آنکھیں بچھا کر جس محبت، عقیدت، خلوص اور وفاداری کا اظہار کیا ہے، اس سے ساری دنیا پر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ انتخاب کی اس تاریخی جنگ میں تم نے کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی کو ٹھکرا کر اپنے لئے آزادی، وقار اور انصاف کا راستہ اختیار کیا ہے۔

[illegible]

(باقی صفحہ ...)

شمیم احمد شمیمؔ: بحیثیت صحافی۔

شمیم احمد شمیمؔ ایک صحافی تھے اوران کا نقطہ نظر سائنسی تھا انہیں تاریخ،فلسفہ،سماجیات اور موجودہ دور کی تیز رفتار صنعتی ترقی کا احساس تھا۔یہی وجہ تھی کہ کبھی کبھی حالات اور واقعات پر ان کی بے باکی رائے اور ردّعمل بڑی بڑی غلط فہمیوں کو جنم دیتا تھا۔''آئینہ'' شمیم احمد شمیمؔ کے ذہن اور ضمیر کی آواز تھا کئی بار آئینہ کو مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔آپ نے ہر اس کوشش کو ناکام بنا دیا جو آپ کی ذات کی طرف جانے کی کوشش کرتی اسی وجہ سے انہیں مختلف الزامات سے بھی نوازہ گیا۔کبھی ان کو موقع پرست کہا گیا کبھی شکست خور کہا گیا لیکن انہیں اپنے اوپر اعتماد تھا۔وہ اپنے آپ کو صرف اپنے ضمیر کے سامنے جوابدہ سمجھتے تھے اور دنیا کی پرواہ کیے بغیر اپنے مشن کی تکمیل میں مشغول رہتے وہ اکثریت سے خوف زدہ نہیں ہوئے۔وہ صحافت سے تجارت نہیں کرتے تھے وہ ان دونوں کا فرق واضح طور پر جانتے تھے۔انہوں نے صحافت کو صحافت ہی رہنے دیا اس کو تجارت کے طور پر نہیں اپنایا۔

انہوں نے صحافتی دنیا میں ''آئینہ'' کے ذریعہ یہ مثال قائم کی کہ صحیح معنوں میں صحافت کا مفہوم کیا ہے اور اس کو عملی جامہ پہنا کر دکھایا۔اور اس راستے میں آنے والی رکاوٹوں کا بڑی ہی دلیری اور جواں مردی سے مقابلہ کیا۔ریاست جموں وکشمیر کی وہ نسل جو آزادی ہند کے بعد پروان چڑھی یہ نسل ذہنی طور پر ایک اضطراب اور کشمکش میں مبتلا رہی ہے۔ملک کی تقسیم نے سب سے زیادہ نقصان کشمیری عوام اور ان کی نئی نسلوں کو پہنچایا۔تاریخی اعتبار سے یہ نسل ایک پرآشوب اور برے دور سے گزری ہے اس نسل نے اپنی آنکھوں سے ان حالات کو دیکھا ہے۔انسان کو انسان کے خون کا پیاسا دیکھا تھا سب کچھ بکھرتے دیکھا ہے۔اخلاقی قدروں کی پامالی دیکھی ہے۔سیاست کے لٹیروں کے ہاتھوں ریاست کو لٹتے دیکھا ہے۔رہبروں کو رہزنوں کی شکل میں دیکھا فریب دغابازی اور بے ایمانی عام تھی اس گندے ماحول اور بے بس دور میں جو نسل پروان چڑھی۔اس نسل کی ذہنی تربیت کیا رہی ہوگی تنگ نظری فرقہ پرستی اور توہم پرستی اسی نسل کے حصّے میں آئی ہے۔

شمیم احمد شمیمؔ اسی دور کی نسل کا ترجمان بھی ہے اور آواز بھی ہے اس کا مشن یہ تھا کہ یہ نسل خوداری خوداعتمادی

اور بے خوفی کا فن سیکھے اور علم اور تعلیم سے آراستہ ہو جائے۔ ہر آدمی اپنے حقوق کی خاطر لڑنے والا بن جائے۔ اپنے لئے اچھے اور برے میں تمیز کرنے والا بن جائے۔ لیکن بد قسمتی کہ بات یہ ہے کہ شمیم احمد شمیمؔ جو کچھ کرنا چاہتے تھے انہیں اس قسم کا ساتھ نہیں ملا انہیں اُن لوگوں کی تلاش تھی جو اُن کے درد میں شریک ہو سکیں اور قوم کو ایک ڈگر تک لے کر جائیں جس کے لئے انہوں نے ساری زندگی ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔

سیاست سے، صحافت سے، تقریر سن انہوں نے قوم کو ایک راہ دکھائی اور آخر کشمیر کی عوام کی آواز بن کر ''آئینہ'' کی اشاعت کی وہ صرف شمیم کی ذات کی آواز نہیں تھی بلکہ کشمیر کے تمام لوگوں کی آواز تھی جو ''آئینہ'' کی شکل میں نمودار ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب قوم سوچ، فکر اور سنجیدگی سے دور ہو رہی تھی۔ سیاسی طور پر بالغ بھی نابالغ تھے اور ''رائے شماری فوراً کرو'' کے نعروں سے وادی گونج رہی تھی۔ مسئلہ کشمیر جوانوں کے لئے ایک جزبہ بن کرا بھر رہا تھا۔

شمیم نے اس دلدل میں نو جوانوں کو ایک سوچ اور فکر کے تحت بڑی چھوٹی باتوں پر غور کرنے کا ذہن دیا۔ انہوں نے نو جوانوں کے اندر سنجیدگی کا عنصر بھرنے کی کوشش کی۔ مسئلہ کشمیر اور کشمیر کی تاریخ اور اس کے مستقبل سے جوانوں کو آگاہ کیا جو ایک ایسے بھنور میں عنقریب پھسنے والے تھے جس سے نکلنا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دشوار ہو جاتا۔ شمیم دوران علی گڑھ صبح کے 4 بجے بیدار ہو کر ''آئینہ'' کے لئے لکھتے اور آئینہ کی وہ سب خوبصورت تحریریں سرزمینِ سرسیّد میں جنم لیتی۔ چمن سرسیّد میں دوران تعلیم ان تحریروں کو لکھ کر بھیجا جاتا جس میں سرسیّد کی بُو بھی شامل ہوتی کیوں کہ اسی دیار کے خیالات اور ماحول نے شمیم کو ایک قومی رہبر اور مبلغ بنا دیا تھا۔

ہفت روزہ آئینہ۔

''آئینہ'' دراصل یہ قلم کے ایک ایسے سپاہی کی داستان ہے جس میں جرأت مندی اور بہادری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایک سیاسی شخص کی انقلابی سوچ کا عکس ہے کہ آج بھی جس نامور استاذ صحافی کا نام آتا ہے تو ذہن میں ہمت اور جسارت کے مجسمے ہاتھ میں قلم لئے پتھر پر اس طرح لکھتا دکھائی دیتا ہے گویا سخت چیز پر با آسانی لکھتا ہو۔ جس کے قلم کی نوک تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز ہے جس کی نوک پر بے باکی، شائستگی اور سلاست کی دھار ہے۔ ان کو پڑھنے پر ایک انفرادی سوچ کا احساس ہوتا ہے وہ اپنی صحافتی دنیا میں ایک منفرد ستارہ تھا جس کا اپنے دور میں کوئی ہم پلہ نہیں تھا اپنی سیاسی زندگی میں بھی وہ ایک عوامی خدمت کا درجہ رکھتے تھے۔

فروری 1967ء میں انتخابی معرکہ سر کرنے کے بعد جہاں ایک طرف انہوں نے اپنی شعلہ بیانی سے ایک مختصر سی لیکن ایک بے مثالِ تاریخ رقم کی وہیں انہوں نے کچھ عرصے بعد خود اس بات کا اعتراف کیا کہ سیاسی دنیا میں مخفی اور عیاں حقائق کی تلخیاں ان کی بصیرت میں اضافہ کر چکیں تھیں یوں ڈھائی سال کی ممبر اسمبلی کی زندگی سے وہ نہ صرف اکتا گئے تھے بلکہ استعفیٰ دینے کے بارے میں بھی سنجیدگی سے سوچ رہے تھے۔خود ان کے الفاظ ہیں:۔

''میں اس بات پر غور کر رہا ہوں کہ مجھے مستعفیٰ ہو کر اپنے ضمیر کو مطمئن کرنا چاہئے۔یا اپنی بے سود جد وجہد کو جاری رکھ کر ان لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے جنہوں نے مجھے منتخب کر کے مجھ سے کچھ توقعات وابستہ کیں تھیں۔دوسرے الفاظ میں مجھے اپنی شکست کا باقاعدہ اعلان کر دینا چاہئے یا نہیں''۔[1]

آئینہ کے بارے میں دنیا جانتی تھی کہ یہ ایک بے باک اخبار ہے اور یہ بات بھی مانتی تھی کہ ''آ ئینہ'' کسی طوفان سے کم نہیں وہ ایک جنون میں ڈوبے شخص ہیں اور وہ جنون تھا کشمیر کی خوشحالی اور اس قوم کو دلدل سے باہر نکال لانا۔ان کی سیاست پر ان کی صحافت بھاری تھی جوان کو بار بار سیاست کے میدان میں جھنجوڑتی اور اپنی تحریروں سے وہ اپنی زندگی کے آخری دم تک اپنے قارئین کے قلب وجگر کو گرماتے رہے اور حق بات کہتے رہے

کل آٹھ صفحات پر مشتمل یہ ہفت روز آئینہ جس کی تحریروں میں ایک کاٹ تھی جس کا مقصد اس بگڑے نظام اور بگڑے ماحول کی درستگی تھا جس ماحول اور نظام کا شمیم احمد شمیمؔ نے اندرونی اور بیرونی دونوں طرف سے گہرا مطالعہ کیا تھا۔انہیں اس سیاسی نظام اور اس کے ٹھیکیداروں سے ان کے افعال کی بناء پر ایک عجیب نفرت ہو گئی تھی۔چونکہ وہ ان کے اندرونی حالات سے اچھی طرح واقف تھے کیوں کے وقت کے رہنماء انہیں جس سیاسی ڈگر پر چلانا چاہتے تھے ان راہوں کو شمیم احمد شمیمؔ نے منظور نہ کیا اور ان کے قلم سے مزید زہر نکلنے لگا جو آئینہ کی صورت میں عوام تک پہنچنے لگا اور آئینہ کی تحریریں آگ اگلنے لگیں جس نے نہ صرف وقت کے سیاستدانوں کی نیندیں حرام کیں بلکہ آج بھی ان کے ان گنت جملے ضرب المثل ہیں۔

آئینہ کی تحریروں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی تحریروں میں نہ صرف ایک سائنٹیفک

اپروچ تھی بلکہ انسانی شعور،انسانی احساسات ، انسانی سوچ ،حقیقت بیانی ، چوروں اور مگر مچھوں کی حقیقت ،سماج کا آئینہ،موجود تھا۔ چراغ بیگ کے نام سے لکھے گئے کالم نہایت ہی عمدہ قسم کے مضامین ہوا کرتے تھے ان مضامین کو پڑھ کر لوگ حقیقی صورت حال سے واقف ہوتے تھے دراصل اس درد اور اخلاص سے ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ آج چار دہایاں گزرنے کے بعد بھی ان تحریروں میں آدمی کھو جاتا ہے اور اس وقت کا سارا منظر آنکھوں میں دِکھائی دینے لگتا ہے۔

انہوں نے نازک اور حسّاس موضوعات کا اتنی اعتدال پسندی کے ساتھ احاطہ کیا ہے کہ ''ماں بیٹی کے خطوط'' ''پنڈت بھائیوں کے نام'' ''مسئلہ توہینِ قرآن'' جیسے مضامین جب بھی سامنے آتے ہیں تو ایک امید بن جاتی ہے کہ آج بھی اس طرح کی موثر اور معتبر تحریریں اپنے وجود سے اجالا کر رہی ہیں۔

اس ضمن میں محمد رضوان اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

'' آج بھی اردو صحافت کے حوالے سے جب کسی مدیر یا اردو اخبار کا ذکر ہوتا ہے تو شمیم صاحب ''آئینہ'' اور ''چراغ بیگ'' سر فہرست نظر آتے ہیں مداح تو مداح خود اس کے حریف بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ۔

چھپا لیا جسے پت جھڑ کے زرد پتّوں نے
ابھی تلک ہے بہاروں پہ حکمراں وہ شخص ۔۲

شمیم احمد شمیمؔ ایک پرعزم صحافی تھے۔ جنہوں نے سیاسی بہار کا بھی مشاہدہ کیا اور اختلافات کے برے موسم کو بھی دیکھا۔ انہوں نے اپنے قلم کی روانی سے یہ بات ثابت کر دی کہ وہ اقتدار اور شہرت کے اسیر نہیں ہیں ان کی اخبار نویسی محدود وسائل کے ہوتے ہوئے بھی جرأت کی منزل تک پہونچ گئی تھی وہ ایک پرعزم مسافر تھے جن پر کبھی بے حِسی اور مایوسی کا طلسم اثر نہیں کر سکا وہ ایک ایسے شخص تھے جنہوں نے اپنی تمام عمر امتحانوں میں کاٹ دی تھی وہ اپنی شکست کا اعتراف کرنے میں بھی ہچکچاتے نہیں تھے لیکن اپنی بے نیازی کی وجہ سے اس ہنر سے واقف تھے کہ نوجوان کے مخالفین کا زور قلم سے پاش پاش کر دے۔ شمیم احمد شمیمؔ کو جب جب بھی یاد کیا جائے گا تو ان کی تحریریں ساتھ ہی

نگاہوں کے سامنے آجائیں گی کیوں کہ ان کی بے باک جرأت مندانہ تحریریں ہمیشہ اپنی گونج پیدا کرتی ہیں گی ان کی تحریریں آج بھی چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں۔

میں خزاں کی دھوپ کا آئینہ کہ میں اک ہو کہ ہزار ہوں
کہیں آنسوؤں کا ہو قافلہ کہیں جگنوؤں کی قطار ہو۔

شمیم احمد شمیمؔ نے صاف گوئی اور سچائی کا دامن تھام لیا تھا جس سے انہوں نے اپنی منفرد بے باکی کے نقوش ثبت کرتے ہوئے ہمیشہ کے لئے اپنی تحریروں کو آبِ حیات پلا دیا گیا۔

شمیم احمد شمیمؔ کی لازوال تحریریں سیاست دانوں کے مسخ شدہ چہروں کی سیاہی سے لکھی گئی ہیں۔ صاحب اقتدار اور امیر زادوں کے فریب اور جھوٹی رہبری ان کے نوک قلم سے پارہ پارہ ہو کر رہ گئی وہ صحافت کا ایک اہم ستون تھا۔ اور آنے والی نسلیں ان کی تحریروں کو ادب نہیں کشمیر کے دور آشوب کی جیتی جاگتی تاریخ سمجھ کر پڑھیں گی۔ ان کی سیاست میں بھی بغاوت تھی۔ کئی لوگوں کو ان کی باتوں اور تحریروں سے اختلاف رہا ہے۔ کئی لوگ اس کی فکر کو ایک پریشان خواب کی طرح سمجھتے رہے۔ کئی لوگ ان کی آتش بیانی سے اپنے دامن بھی بچاتے رہے لیکن ان کے بد ترن دشمن بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ شمیم کے قلم کو خدا نے بے باکی اظہار سے نوازہ تھا۔ قدرت نے انہیں حق بات کہنے کی جرأت دی تھی اسی حق گوئی نے ان کے دوستوں کو بھی ان کا دشمن بنا دیا تھا۔

آئینہ کی ادبیّت میں شمیم احمد شمیمؔ کی تحریروں کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ طنز و مزاح سے بھرپور ان کے جملے سنگ و خشت کی بارش معلوم ہوتے ہیں۔ شمیم احمد شمیمؔ کی شجاعت اور بہادر زندگی ہماری دھیمی فکر میں ایک آگ برپا کرتی ہے۔ ان کی تحریریں شعلہ بیاں تھیں جو کسی کے فریب اور دباؤ میں نہ آتی تھیں۔ ان کی انفرادیت مرتے دم تک قائم رہی۔ آخری وقت زندگی تک وہ موت کو بہلاتا رہا اور موت اس سے بہلتی رہی۔

شمیم احمد شمیمؔ کی نگارشات کا مطالعہ کرتے وقت یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ صرف ایک ادیب ہیں جو مختلف سماجی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ شمیم احمد شمیمؔ نے جس طرح کشمیر میں صحافت کی ایک نئی سمت متعیّن کی اس کا مقابلہ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد ، خواجہ احمد عباس۔ حیات اللہ انصاری جیسے برگزیدہ شخصیات اور ادیبوں کے جریدوں اور اخبارات سے کیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرون ملک میں بھی اپنے پیشے کو ایک نئی

جلابخشی۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ریاست جموں وکشمیر ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں بھی ان کے بعد کوئی صحافی پیدا نہیں ہو سکا جس کے قلم کی قوت سے اعلیٰ ایوان لرز اٹھے ہوں یا جس نے لوگوں کے ذہنوں کو ذرا بھی جھنجوڑنے کی کوشش کی ہو۔

شمیم احمد شمیم کی زندگی کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ انہوں نے بنیادی طور پر ایک صحافی کی حیثیت سے اپنا کام شروع کیا لیکن بعد میں ایک سماجی کارکن اور سیاستدان کا زاویہ نظر اپنا کر بھی اپنے قلم کو جس طرح توازن میں رکھنے کا کام انجام دیا اس کی مثال ملنا بہت مشکل ہے۔اکثر دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ صحافی اپنے مخصوص سیاسی عقائد کو کھلے عام اظہار کرنے کی رو میں اس طرح بہہ جاتے ہیں کہ پانی کے معمولی بہاؤ سے بھی ان کا نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

''آئینہ'' میں شمیم کی تحریریں ایک ایسا امتزاج پیش کرتی ہیں کہ نہ صرف شمیم کے قلم کو صحافت کی اعلیٰ بلندیوں کو چھوتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے بلکہ ان کی اردو زبان پر دسترس بھی صاف جھلکتی نظر آتی ہے دور حاضر میں بھی کئی ایسے صحافی مل جاتے ہیں جو کہ اپنے آپ کو ایک بے باک صحافی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اخلاقی اقدار اور قانون کی پاسداری کا سبق دیتے ہیں۔لیکن وہ اس وقت اپنے ہی لفظوں کی دھجیاں بکھیر دیتے ہیں جب وہ معمولی سے معمولی مقدمے کا شکار ہو جاتے ہیں۔شمیم وہ صحافی تھے جو ریاست کے مشہور ومعروف سیاسی رہنماء مرحوم شیخ محمد عبداللہ کے گرویدہ رہے ہیں لیکن وقت آنے پر انہوں نے اپنے قلم کو انکے خلاف بھی بڑی بے باکی سے اس حد تک استعمال کیا کہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی شیخ صاحب کی حکومت نے انہیں سرکاری کوارٹر سے زبردستی باہر کرنے میں عار نہ سمجھی۔یہ شائدان کے ایک مستقل ارادے کا نتیجہ تھا جس کا انہوں نے بار بار اظہار کیا تھا۔جس کا بھرپور اندازہ ان کی نگارشات سے ہو جاتا ہے۔انہوں نے مزاح کا سہارا لیتے ہوئے جو چراغ بیگ کے نام سے خاکے لکھے ہیں ان سے ان کے ذہن کی پختگی بھرپور طریقے سے جھلکتی ہے ان تحریروں میں شمیم احمد کسی بھی بڑی شخصیت پر وار کرنے سے ہچکچاتے نہیں تھے۔کئی شخصیات کا خاکہ انہوں نے ایک منفرد انداز میں کھینچا ہے۔

شمیم احمد شمیم کی ''آئینہ'' کی تحریریں کشمیر کی سیاست ادب اور فنون لطیفہ سے جڑے ہوئے لوگوں کی حیات کا احوال ہیں۔انہوں نے نہ صرف سیاست اور سماج کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی بلکہ انہوں نے ادب کے حوالے

سے بھی بے پناہ خدمات انجام دیں۔ ''آئینہ'' میں انہوں نے تنقید، کشمیری ناول، زبان وادب، ثقافت، افسانہ نویسی فلم اور ایسے دوسرے موضوعات پر سیر حاصل تبصرے کئے ہیں جو آج بھی تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے ایک خزینے سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ ''آئینہ نماء'' کی چھٹی جلد جس کا نام قرات العین صاحبہ نے ''پھلجڑیاں'' رکھا ہے۔ اس میں شامل تحریروں کے حوالے سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ اس میں شامل موضوعات جیسے اسمبلی نامہ، اسمبلی کی جھلکیاں، حاضر جوابی، فقرے بازی، اعلان گمشدگی، شمیم کے قلم میں موجود ایک منفرد مزاح نگار کا ایک ایسا تعارف پیش کرتی ہیں جسے واقعی ایک قاری کو ان کی شخصیت کے بارے میں اپنی رائے قائم کرنے میں مشکلیں پیدا ہوں گی۔

آئینہ'' کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آج بھی جب ہم ان کا مطالعہ کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ شمیم احمد شمیمؔ زندہ ہیں۔اور ہمارے آس پاس حالات کا مشاہدہ اس طرح کررہے ہیں جس طرح وہ آج سے پچاس سال قبل کر رہے تھے۔ کیوں کہ اگر سیاست کی طرف نگاہ کی جائے تو ہمارے حکمرانوں کے حالات وواقعات اور کام کرنے کے ڈھنگ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔صرف یہ تبدیلی ہوئی ہے کہ کردار ادا کرنے والوں کے نام بدلے ہیں کام وہی ہے جو آج سے پچاس سال پہلے حکمران کرتے آئے ہیں۔سماج کے دوسرے شعبوں میں بھی فریب کاروں، سماج کے ٹھیکیداروں، سرمایہ داروں اور استحصالی عناصر کی تصویر کشائی آج بھی اگر اخبارات میں شائع کی جائے گی تو یہ محسوس نہ ہوگا کہ یہ'' آئینہ'' کی تحریریں آج سے پچاس سال پہلے کی ہیں اور شمیم نے وہ نقشہ تب کھینچا تھا۔ شمیم کی نظر اتنی گہری تھی کہ ان کے بہادر قلم کا'' آئینہ'' برسوں کی ایک مخصوص تصویر کھینچنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

شمیم احمد شمیمؔ نے'' آئینہ'' کے ذریعے صحافت جیسے تناور درخت کی بنیاد اعلیٰ اقدار پر رکھی تھی جو کہ ان کے جانے کے بعد مرجھا گیا لیکن اب'' آئینہ'' نما کی اشاعت سے درخت کے پتوں کی ہریالی پھر سے لوٹ آئی ہے اور نئی نسلوں نے پھر سے شمیم کو پڑھنا شروع کیا ہے۔

شمیم احمد شمیمؔ صحافتی دنیا کے ان اشخاص میں سے تھے جن کی عمر کا سورج دن دھاڑے ہی غروب ہو گیا۔لیکن اس مختصر زندگی میں انہوں نے صحافتی میدان میں وہ نقوش چھوڑے ہیں جو رہتی دنیا تک قائم دائم رہیں گے اور آئینہ میں وہ کارنامے ہیں جن سے ان کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔شمیم احمد شمیمؔ صحافت کا ایک شگفتہ چہرہ ہے۔

قدرت نے انہیں حاضر جواب اور تقریر و تحریر پر یکساں قدرت رکھنے والا ادیب وصحافی بنایا تھا جس کو مرحوم شمیم کہتے ہوئے بھی کچھ عجیب سا لگتا ہے۔اس شخص کی موت اور حیات پر دوست اور دشمن سب ہی آنسوؤں کی بارش رو رہے تھے۔شمیم احمد کے استاد شوریدہ کاشمیری ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''شمیم احمد کو میں نے پہلی بار شوپیان میں اس وقت دیکھا تھا جب وہ چھٹی جماعت میں زیرِ تعلیم تھا۔قمیض اور کِٹ میں ملبوس اس چست و چالاک لڑکے کے بشرے سے ذہانت وفطانت کے آثار ٹپکتے تھے اور وہ اپنے ہم جولیوں میں ہر لحاظ سے غیر معمولی نظر آتا تھا۔دیکھنے والا دل میں کہتا'' ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' پھر وہ وقت آیا غالباً 50ءیا 51ء کا سَن جب شمیم کو میٹرک کے امتحان میں داخل ہونا تھا۔ ایک دن اس کے والد بزرگ نے خواہش ظاہر کی کہ میں ان کے بچے کو جاڑے کی چھٹیوں میں امتحان کے لئے تیّار کروں۔میں نے کچھ تامل کے بعد اثبات میں جواب دیا۔چنانچہ شمیم میرے پاس پڑھنے کے لئے مسلسل دو مہینے شوپیان سے پنجورہ آتا جاتا رہا۔برف و باراں کے دوران وہ کبھی میرے یہاں ہی ٹھہرتا اس کو خصوصیت سے حساب کے مضمون میں رہبری کرنی پڑتی تھی۔انگریزی اور اردو میں بخوبی چل سکتا تھا۔دیگر مضامین خود تیار رکرتا تھا۔اس کے برعکس اس کے ہم سبق پنجورہ کے محمد یاسین خان کو تمام مضامین میں رہبری کرنی پڑتی تھی۔دو مہینے کی قلیل مدّت میں وہ کیا کرسکتا تھا آخر نتیجہ یہ نکلا ایک بخیر وخوبی امتحان میں کامیاب ہوگیا لیکن دوسرا رہ گیا۔

1955ء 1956ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں آرٹس میں داخلہ لے کر بی اے پاس کیا۔میں نے اس زمانے میں وہیں ایم اے

کیا۔ایم۔اے کے امتحانات کے ایّام میں اکثر نصف رات کو کوئی
طالب علم بدر باغ کے کھلے میدان میں چار پائی اور مچھر دانی تانے اور
اس کے اندار شمع یا لالٹین فروزاں کیئے پڑھنے میں مصروف نظر آتا
تھا۔اور وہ شمیم احمد شمیمؔ تھا'' ۳؎

شمیم کے بارے میں شہر یار لکھتے ہیں۔

''شمیم صاحب علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک ایسے طالب
علم تھے جس پر یونیورسٹی بجا طور پر فخر کرسکتی ہے 1960ء سے علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے اور اس یونیورسٹی سے سابق
طالب علم ہی نہیں وہ لوگ بھی بقدر ظرف فائدہ اٹھا رہے ہیں جن کا
یونیورسٹی سے کوئی جائز یا نا جائز تعلق کبھی بھی نہیں رہا۔شمیم نے علی گڑھ
سے محبت کی تجارت نہیں کی۔کاش علی گڑھ والے شمیم کی اس خوبی کی
قدر کر سکتے اور علی گڑھ میں اِن کی کوئی مناسب یادگار قائم کر سکتے۔'' ۴؎

شمیم صاحب نے صحافت میں کشمیر کی سیاسی ،سماجی ، بدحالی اور استحصال کرنے والے ان بے ضمیر اور قوم دشمن عناصر کی نقاب کشائی اور نشان دہی کی جنھوں نے ذاتی مفاد کے لئے حکمرانوں کے ظلم و جبر کی پشت پناہی کی۔'' آئینہ'' اور مدیر آئینہ کا اردو صحافت کی پوری دنیا میں ایک اعلیٰ مقام تو ہے ہی تاہم ریاست کی حد تک ابھی اس میدان میں آئینہ اور صاحب آئینہ کا کوئی ثانی پیدا نہیں ہو پایا ہے۔آئینہ کے بارے میں یہ بات تو اب اس حد تک پہونچ چکی ہے کہ اس کو پڑھنے والوں میں نہ صرف چاہنے والے اور شیدائی ہی شامل تھے بلکہ وہ بھی آئینہ کو پڑھے بغیر نہ رہ سکتے تھے جو آئینہ اور اور اس کے خالق دونوں کے شدید مخالف تھے غلام محمد صادق ،بخشی غلام محمد ،سیّد میر قاسم ،ڈی پی در وغیرہ آئینہ کے بلا ناغہ قاری تھے۔مرحوم شیخ صاحب کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے کہ مرحوم شیخ محمد عبداللہ اور شمیم کی دوران اختلاف بھی شیخ محمد عبداللہ صاحب آئینہ کا مطالعہ خاص طور پر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سیاسی دنیا سے دور اور قطع نظر آل احمد سرور ہوں یا کرشن چندر ، سلمیٰ صدیقی ہوں یا ساحرؔ لدھیانوی ہوں یا اے جی

نورانی ہوں یا رفیق زکریا سبھی آئینہ کی تیکھی تحریروں اور شمیم کے اس بے باک رویّے کے مدّاح اور معترف تھے۔
شمیم کی کس کس خوبی اور کس کس ادا کا بیان کیا جائے شمیم کے ایک قریبی دوست ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ
''جب شمیم صاحب الیکشن ہار گئے تو میں الیکشن کے بعد شکست کی ذلّت سے بچنے کے لئے ٹھیکیداری کی آڑ میں لدّاخ چلا گیا۔ شمیم صاحب کی مروّت کا یہ عالم تھا کہ وہ روزنامہ ''آئینہ لیہہ سے 35 کلومیٹر دور کارو میں بھی مجھے مسلسل بھیجتے رہے۔ میں نے لدّاخ کے بارے میں اپنا تاثر یوں لکھ کر بھیجا

۔''لدّاخ کی سرزمیں پر قدم رکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں جیسے پہلی بار انسانوں کے بجائے خدا کی زمین پر آ گیا ہوں۔ جہاں اپنی مرضی سے سانس لے سکتا ہوں۔ کیوں کہ یہاں نہ کوئی شیر کشمیر ہے نہ فخر کشمیر، نہ مفکّر کشمیر ہے نہ آفتاب کشمیر۔ اس پر ان کا جواب تھا۔

''لدّاخ کی بلندیوں سے پستیوں میں بسنے والے دوست کو یاد کرنے کے لئے شکریہ۔ تم نے لدّاخ کی کچھ اس طرح تعریف کہ کہ دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر تمہارے پاس چلا آؤں لیکن کیا کروں پاپی پیٹ کا سوال ہے۔''۔

انہوں نے مولانا مسودی کے بارے میں پوچھا تھا کہ ان کا کیا حال ہے۔ شمیم صاحب کا جواب اس بارے میں یوں تھا۔

''تم جانتے ہو کہ میں مولانا کی درویشانہ زندگی، ان کی سادگی، ان کا علم وفضل اور ان کی ذہانت اور ذکاوت کا مدّاح رہا ہوں لیکن تم اس بات سے بھی بے خبر نہیں ہو سکتے کہ ان کی بے جا مصلحت پسندی اونٹ کا گوشت ہے جس کا ہضم کرنا میرے بس کی بات نہیں مولانا ہر بات میں کچھ کچھوے کی چال چلتے ہیں ہوسکتا ہے کہ ان کے کان میں کسی نے یہ بات ڈال دی ہے کہ وہ خضر کی عمر رکھتے ہیں۔ یہاں حالت دوسری

ہے میرے پاس نہ اتنی فرصت ہے نہ مہلت۔ کیڑے مکوڑوں کی طرح

ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جینا مجھے ہرگز منظور نہیں۔'' ۵

مزید لکھتے ہیں کہ نومبر میں میری شادی تھی شمیم صاحب ہمارے گھر تشریف لائے محمد یوسف ٹینگ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ٹینگ صاحب کا نام تو میں نے سن رکھا تھا تاہم جان پہچان نہ تھی۔ رخصت ہوتے وقت گھر سے باہر قدرے دوری تک ان کے ساتھ آیا۔ مجھ پر ایک نظر ڈالی میرے سوٹ کی خوب تعریف کی یاد رہے یہ سوٹ انہوں نے ہی سلوایا تھا۔ اس کے بعد ٹینگ صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ ظفر کو کہیں ایڈجسٹ کر دو۔ اس سے پہلے کہ ٹینگ صاحب ہاں یا نہ کہیں خود ہی بولے نہیں میں نے تمہیں کہا ہے کہ نوکری ہرگز نہ کرنا۔'' ٦

شمیم احمد کا ''آئینہ'' ان کا تخلیقی ذہن، ان کی قلمکاری خود ان کی عظمت کی ایک کھلی کتاب ہے۔ انہوں نے ابھی عالم ِ جوانی میں زندگی کے مختلف تجربات سے گزر رہے تھے۔ صحافتی دنیا کی نئی راہوں اور نئی سمتوں کی نشان دہی کر کے ایک نئی قسم کی بنیاد ڈالی۔ کشمیر کا حکمرانی طبقہ ہو یا ہندو پاک کا کوئی بڑے سے بڑا لیڈر، ان سب کی خامیوں کی نشان دہی کرنا شمیم احمد شمیمؔ کا ایک جرأت مندانہ اور منفرد عمل تھا۔ یہی جمہوریت کی بنیاد بھی ہے شمیم کو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے ادبی وصحافی علمبرداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ طبعی آزادی کی کیفیت نے شمیم کو ایک حقیقت پسند ادیب، سیاسی راہنما کی حیثیت سے پروان چڑھایا اور ساتھ ہی ساتھ خاندانی اثرات نے بھی ان کے دل ودماغ میں ایک انفرادیت پسندی کا جزبہ بھر دیا۔ جہاں یہ جزبہ اپنی قابلیت کی بنا پر بڑھتا گیا وہاں اس نے اپنے زورِ قلم سے اپنے لئے ایک مقام بھی پیدا کر دیا۔ شمیم صاحب کی طبیعت میں جو جذباتیت تھی وہ دراصل ایک سچائی کی شکل ہوا کرتی تھی۔

''آئینہ'' میں شمیم صاحب نے جو کچھ بھی لکھا وہ ان کے صحیح احساسات کی حقیقی عکاسی ہوتی تھی۔ انہوں نے کبھی چاپلوسی اور نیازمندی کے حربے کو قبول نہیں کیا۔ اگر وہ بھی دوسروں کی طرح خوشامدی، چاپلوسی، اور نیازمندی والی بری حرکتیں کرتے تو زندگی بھر عیش و آرام سے گزارتے۔ جس طرح دوسرے حکمرانوں کے اقتدار میں آنے کے بعد اتنا تو مال جمع کر ہی لیتے ہیں جو ان کی سات نسلوں تک ختم نہ ہو لیکن شمیم نے ایسا نہیں کیا وہ ایک ممبر آف لیجسلیٹیو اسمبلی بھی رہے وہ ممبر آف پارلیمنٹ بھی رہے لیکن جب شمیم دنیا سے جا رہا تھا ایک کرائے کا مکان تھا اور ایک پرانی

سائکل ۔ یہاں تک کہ جب سرکاری کواٹر سے بھی نکال دئے گئے ،تو اپنے کسی رشتہ دار سے ایک آدھ کمرہ لے کر اس میں اپنی پوری فیملی کے ساتھ رہ رہے تھے۔اور انتقال فرما گئے ۔ ورنہ پیسہ تو وہ بھی کما سکتے تھے۔اخبار ان کا اپنا تھا۔ ریاستی وزیر بھی رہے۔ پھر پارلیمنٹ میں رہے لیکن ان کی صحافت کا ان کی سیاست کا ان کے اقتدار کا ایک ہی مقصد تھا کہ سچائی ،ایمانداری اور حقیقت پسندی جس حق کو بولتے ہوئے شمیم کو وقت کے حکمرانوں نے بہت مجبور بھی کیا لیکن وہ باز نہ آئے ۔اگر کیا ہوتا تو اتنے مصائب اور خطرات کا سامنہ نہ کرنا پڑتا۔

شمیم ایک صحافی ہوتے ہوئے بھی جموں وکشمیر اسمبلی میں بطور ایک معزز آزاد ممبر کی حیثیت سے حزبِ اختلاف کا رول ادا کرتے رہے۔ان کی تحریروں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جموں وکشمیر میں جمہوری مزاج کی بنیاد ڈالنے کا سہرا ان کے سر ہے اس جمہوری مزاج کو پروان چڑھانے میں اگر سارا نہیں تو زیادہ تر حصہ انکا ہے۔ وہ مزاج انہوں نے اپنے اخبار ''آئینہ'' اور سیاسی سرگرمیوں سے بنایا تھا۔شمیم احمد کے صحافت اور آئینہ کے علاوہ بھی بہت سارے مقامات ہیں ایک مقام ایک ادیب کی حیثیت سے ہے،ایک صاف اور واضح شعور رکھنے والا فنکار خواہ وہ ادیب ہو یا مصوّر زندگی کی سچی عکاسی کرتا ہے۔حقائق کی کھوج کرتا ہے اپنی محنت وتلاش سے زندگی کے عملی مشکلات کا حل ڈھونڈتا ہے۔حل کی کئی راہیں تلاش کرتا ہے۔اس کے پاس موضوع بھی اور مواد بھی ہوتا ہے۔اس مواد کے اصل حقائق کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔شمیم صاحب اسی ڈگر پر چلتے رہے اور مصائب کی پرواہ نہیں کی سچ اور صاف صاف لکھتے رہے جس کی زندہ مثال ان کا ''آئینہ'' ہے۔

اس میں انہوں نے لوگوں کے سامنے زندگی کے تلخ حقائق پیش کئے ۔اور بہت سارے مداریوں کی نقاب کشائی کرتے رہے جس سے لوگ بھی متاثر ہوتے رہے۔شمیم کا ایک اپنا نظام حیات تھا۔ ان کا یہ نظام حیات ایک عام انسان کے نظام حیات سے پوری مماثلت رکھتا ہے۔شمیم صاحب نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو پردوں کے اندر سے پھاڑ کر باہر نکالا ہے۔اخبار ''آئینہ'' میں تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کی تڑپ،غذائی اجناس کی قیمتوں میں اضافہ، رشوت خوری کی بڑھتی لعنت کے خلاف شمیم احمد کے احتجاج سے پر اثر اداریے دلوں کو چھو جاتے ہیں۔ ہر غلط روش کے خلاف احتجاج ہر صبح کے ''آئینہ'' میں پڑھنے میں مل جاتا ہے۔کسی نے شمیم احمد کے بارے میں خوب ہی کہا ہے کہ ''شمیم صاحب سراپا احتجاج تھے''۔ان کا احتجاج ظلم کے خلاف ہے احتجاج فرعونیت کے خلاف ہے،

احتجاج سماجی رسموں اور بدعتوں کے خلاف احتجاج سیاسی بداعمالیوں اور معاشی عدم توازن کے خلاف تھا۔ ان کی صحافت وسیاست میں سیکولریزم کو اہم۔ مقام حاصل تھا۔ سوشلیزم وجمہوریت پر ان کا نہ صرف اعتقاد تھا بلکہ اس قسم کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے ''آئینہ'' سے بہت خدمات لیں۔

''. آئینہ'' کے بارے میں عبدالغنی لون لکھتے ہیں کہ۔''

1964ء میں جب شمیم احمد شمیم نے ہفت روزہ آئینہ کا اجرا کیا کبھی کبھار آئینہ کا ایک آدھ پرچہ ہی آتا۔ جب کبھی سری نگر آنے کا اتفاق ہوتا تو میں ''آئینہ'' ضرور پڑھتا۔ اس دوران میں نے ''آئینہ'' کے کئی خصوصی شمارے اور نمبر حاصل کئے۔ 1970ء سے میں آئینہ'' میں مرحوم شمیم احمد کی تخلیقات اور نگارشات ان کے تا دمِ علالت بلا ناغہ پڑھتا رہا۔ جب کبھی ہفتہ عشرہ کے لئے سری نگر سے باہر چلا جاتا واپس آکر میں کسی ریڈنگ روم میں جا کر ''آئینہ کی فائل دیکھتا یہ غالباً ان کی تحریر کا جادو تھا۔ کہ سری نگر آکر میں نے 1970ء سے پہلے کے آئینہ کے پرانے فائل کھنگالے اور سارے دستیاب شمارے پڑھ لیئے۔ شمیم احمد کی تحریروں کے ایسے شیداء تھے۔ ایک مقامی نیوز ایجنٹ سے سن کر مجھے تعجب نہیں ہوا کہ کئی وزیر اور حاکم ''آئینہ'' کے مستقل خریدار تھے۔ اور باقاعدگی سے اسے پڑھتے تھے۔ میرا یہ تاثر ہے کہ ریاست کے کسی بھی وزیر اعلیٰ کے بعد لدّاخ میں جموں میں اور داوی کشمیر میں کوئی شخص مشہور ہوا تو وہ شمیم احمد شمیمؔ کا نام ہے۔'' ۔٦؎

یہ بات بھی درست ہے شمیم ''آئینہ'' کی وجہ سے پوری ریاست میں اس قدر مقبول تھے کہ لدّاخ جو ایک ریاست سے تھوڑا کٹا ہوا خطہ ہے وہاں کے لوگوں نے بھی ان کو بہت پیار اور محبت بخشی وہیں۔ قدرت نے سیاسی خدمات انجام دینے کا بھی موقع دیا تھا اسی دوران سن سڑسٹھ سے سن اکہتر تک ریاستی اسمبلی میں اپوزیشن کی واحد آواز

تھے۔لوک سبھا میں وہ ایک شعلہ بیان مقرر تھے اوران کی آواز صرف وادی تک ہی محدود نہ رہی بلکہ زوجیلہ کے برفانی کوہساروں کو پھاند کر لدّاخ کے پہاڑوں اور وادیوں میں بھی سنائی دیتی تھی۔لدّاخیوں میں سے اکثر نے شمیم صاحب کو دیکھا بھی نہیں تھا لیکن ان کی تحریریں ’آئینہ‘‘ کے توسط سے کافی لوگ جانتے تھے۔کچھ لوگ دوسروں سے ان کے بارے میں سن کر ان سے محبت کرتے تھے اور کہتے کہ کشمیر میں ایک بہادر نوجوان رہتا ہے جس کی زبان میں جادو ہے اور قلم میں تلوار کی کاٹ ہے اور وہ جوان لوگوں کی بہت خدمت کرتا ہے۔

شمیم کے’’آئینہ‘‘ کی تحریروں کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قارئین کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے اور قائل کرتی ہے۔ان کے نظریات اور خیالات سے اختلاف کی گنجائش ہے لیکن وہ کسی بھی اختلافی اور متنازہ مسئلے پر توجہ صرف کرتے تو اپنے طرز نگارش اسلوب بیان طنزظرافت اور شوخیانہ انداز سے قاری کو اپنا ہم نوا بنا دیتے ہیں۔ان کی تحریر کے تیکھے پن کا سامنا کرنا بہت مشکل تھا۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شمیم اگر صحافت اور سیاست میں نہ آتے تو برِّصغیر کے ایک اہم ادیب ہوتے۔شمیم احمد خود اپنے بارے میں کہتے ہیں۔’’شمیم میں ایک اچھا ادیب بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔لیکن ادب چونکہ ریاض لگن اور توجہ چاہتا ہے۔اس لئے اس نے اپنے لئے صحافت کا راستہ اختیار کیا‘‘۔ آل احمد سرور نے ان کو چٹان کہا،کرشن چندر نے اس کو شعلہ وشبنم کہا۔تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جولوگ اندھیری کھائیوں میں جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں وہی لوگ ترقی کی معراج پر بھی جاتے ہیں۔پروفیسر جی آر ملک لکھتے ہیں:۔

> ’’مجھے شمیم صاحب کا تعارف اپنے زمانہ طالب علمی میں ان کے مؤقر جریدے ہفت روزہ’’آئینہ‘‘ کے وساطت سے ہوا۔اس کا ایک شمارہ کیا دیکھا کہ میں اس کا ہو کہ رہ گیا اور فیصلہ کیا کہ اب اس جریدے کے ہر شمارے کا بلا ناغہ مطالعہ کرنا ہے۔مجھے معلوم نہیں کہ یہ صرف میرا تجربہ ہے۔یا کوئی اور بھی میرا اس میں شریک ہے۔کبھی کبھی کسی مصنف یا صحافی کی کوئی ایک تحریر دیکھ کر آدمی یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ ہو سکے تو اس قلم سے نکلے ہوئے لفظ لفظ کا مطالعہ کیا جانا چاہئے۔کچھ ایسا ہی فیصلہ میں

نے ’’آئینہ‘‘ کے بارے میں کیا تھا۔اور جب تک ’’آئینہ‘‘ہفت روزہ رہا
میں اس فیصلے پر قائم رہا۔‘‘ ۷

’’آئینہ‘‘ نے اپنے اجرائ کے چند ہی سال کے اندر ایک ایسا باوقار مقام حاصل کرلیا تھا کہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے ہفتہ وار’’صدق جدید‘‘اور’’آئینہ‘‘ کا نام برّصغیر میں ایک ساتھ لیا جانے لگا تھا۔کئی سال بعد’’آئینہ‘‘ کوروزنامہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے جوہفت روزے سے مختلف تھا’’آئینہ‘‘ کے قاری ہفت روزہ کوروزنامہ سے زیادہ پسند کرتے تھے دراصل اس دور میں شمیم احمد کی سیاسی سرگرمیاں بھی بڑھ چکی تھیں اگر چہ ان کی سیاسی زندگی میں مددگار روزنامہ ضرور کارآمد ثابت ہوا لیکن ہفت روزہ’’آئینہ‘‘ کا بند ہونا ایک روشن ستارے کے غروب ہونے سے کم نہیں تھا۔شمیم نے جب اپنے اخبار ہفت روزہ’’آئینہ‘‘ کو ایک روزہ’’آئینہ‘‘میں تبدیل کیا تو وہ فیصلہ شمیم احمد شمیمؔ کا درست نہیں تھا۔

شمیم احمد شمیمؔ ایک تخلیقی فنکار تھے ان کے قلم میں رواں دواں دریاؤں کی رفتار اور بلند و بالا پہاڑوں کی جولانیاں تھیں اپنے جذبات اور محسوسات کو وہ صرف ایک ہفتہ وار اخبار ہی کے ذریعے اظہار کی جامع صورت بخشنے میں ماہر تھے لیکن ایک روزہ میں ان کا قلم بہت حد تک ایک ایسے ثانوی عمل تک محدود ہو کے رہ گیا کہ وہ ان پڑھ سیاست دانوں، انگوٹھا چھاپ وزیروں،عوام کا استحصال کرنے والی سیاسی شخصیتوں،تنظیموں اور رشوت خور افسروں کے بیانات کی سرخیوں کی نوک پلک درست کر کے انہیں شائع کرے اس بدزیب اور بےلزت کام میں ان کے اپنے فطری اظہار کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔یہی وجہ ہے کہ روزنامہ’’آئینہ‘‘زیادہ دیر تک اپنی وہ ساکھ برقرار نہیں رکھ سکا جو ہفت روزہ’’آئینہ‘‘ کو ایک قلیل عرصے کے دوران ہی حاصل ہو چکا تھا جس کا مفصل ذکر آگے آرہا ہے۔اسی دوران ایک بار شمیم احمد شمیمؔ ایک معروف روزانہ اخبار کے مدیر کے دفتر میں بیٹھے تھے۔اس اڈیٹر نے طنزاً شمیم احمد شمیمؔ سے کہا’’دیکھا روزانہ اخبار چلانا کس قدر مشکل کام ہے تم نے بھی تجربہ کرلیا جو ناکام ہوگیا۔‘‘شمیم احمد شمیمؔ نے فوراً جواب دیا’’آپ صحیح کہتے ہیں لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ کشمیر میں اخبار پڑھنے والوں کو صرف میٹرک پاس اڈیٹروں کی عادت پڑھ گئی ہے۔پڑھے لکھے لوگ اخبار چلائیں تو وہ انہیں قبول نہیں کرتے۔‘‘ظاہر ہے اس بزرگ اڈیٹر سے شمیم کے اس طنز کا کوئی جواب نہ بن پایا۔

ہفت روزہ آئینہ اپنے قاریوں کے ذہن میں کچھ اس طرح سے چھا گیا تھا کہ جو ایک بار پڑھتا وہ ہمیشہ کے لئے اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ ''چراغ بیگ'' کالم اس قدر عوام میں مقبول ہو گیا تھا کہ اس کو ایک بار نہیں بار بار پڑھا جاتا۔ انسانی آزادی اور انسان کے وقار کے تحفظ کے لئے شمیم کا قلم ایک طاقتور ہتھیار سے کم نہ تھا۔ ''چیکوسوا کیہ کی عصمت دری'' کے عنوان سے انہوں نے آئینہ کے صفحے اوّل پر سقوطِ چیکوسلوا کیہ پر جوز وردار مضمون تحریر فرمایا تھا اس کی صداء ذہن کے تہ خانوں میں جائے بِنا نہیں رہتی۔ ان کی فطری اور طبع زاد ادبی بصیرت کو پہچاننے کے لئے فیض احمد فیضؔ کے لئے گئے انٹرویو کا مطالعہ ہی کافی ہے اس سلسلے میں ان کے ہم عصر کشمیری شعراء کے تنقیدی جائزے نہ روایت کے اثیر ہیں نہ غیروں سے مستعار لئے ہیں بلکہ ایک ایسی بصیرت کے آئینہ دار ہیں جو اصل میں شمیم احمد کی اپنی ہے جس میں بے باکیت اور وحساسیت جھلکتی ہے۔

شمیم تخلیقی کام سے با قاعدہ واقف تھے مگر صحافت وسیاست کی مصروفیتوں نے انہیں اس میدان تخلیق میں موقع ہی نہیں دیا۔ ان کی ساری تحریریں جو بظاہر صحافت کے قبیلے سے ہیں جن میں جزبہ اور احساس کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔ ان تحریروں کا شمار مستند ادب پاروں میں کیا جاتا ہے۔ شمیم کے غمِ ذات کو غمِ کائنات میں تبدیل کرنے کا تخلیقی کرشمہ اگر دیکھنا ہو تو ان کے دوست عبدالقادر دیوان کی المناک موت پر لکھا گیا مضمون ہے۔ بلکہ یہی نہیں صرف شمیم صاحب کے شخصیات پر لکھے گئے خاکے بھی بالخصوص آئینہ کے شخصیات نمبر میں شامل مضامین ان کے بیش بہا ادب پارے ہیں۔

ائینہ کے بارے میں اردو کے معروف فکشن نگار کرشن چندر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

> ''آئینہ'' میں کشمیر کی جن شخصیات کے بارے میں پڑھتا ہوں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں حالانکہ بیشتر ایسی ہستیاں ان میں شامل ہیں جن سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں یہی اس شعلہ صفت انسان کا کارنامہ ہے جسے شمیم احمد شمیمؔ کہا جاتا ہے۔ نام سنا تو لگتا ہے جیسے کوئی نہایت ہی نرم و نازک مہکتا ہوا انسان ہوگا۔ ملاقات کیجئے تو جیسے دھکتا ہوا شعلہ مدافعت کے سارے

> ہتھیاروں سے لیس ہو کے بیٹھا، کون جانے کس وقت گویائی کا کارتوس
> کس طرف چل جائے۔ بری عادت پڑتے دیر نہیں لگتی۔ مجھے بھی
> ''آئینہ'' پڑھنے کی عادت ہوگئی ہے۔اسی اخبار کے بارے میں شاید یہ
> کہا گیا ہے ''چھٹتا نہیں ہے منہ سے کافر لگا ہوا''۔۸

''آئینہ'' کشمیر کی وہ آواز تھا جو صرف کشمیر ہی میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں اپنا اہم مقام حاصل کر چکا تھا۔ بڑی بڑی شخصیات اس اخبار سے متاثر تھیں۔ اڈباء، سیاستدان اور عوام سب ہی'' آئینہ کے قاری تھے اور'' آئینہ'' کے آنے کا بے صبری سے انتظار کرتے اور پھر شمیم صاحب کی تحریروں کو مزے لے لے کر پڑھتے۔ اسی ضمن میں اردو زبان وادب کی ایک اور معروف شخصیت آئینہ'' کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔

> ''اردو صحافت میں ان کے قدموں کے نشان ہمیشہ باقی رہیں
> گے۔ایک بے باک نڈر اور حوصلہ مند صحافی کی حیثیت سے انہوں نے
> جو خدمات انجام دیں ہیں اسے بھلایا نہ جاسکے گا۔انہوں نے'' آئینہ''
> اس شان سے نکالا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے وادی کے اہم ترین
> جریدوں میں مقام حاصل کرلیا۔ پھر جب پانسا پلٹا تو کیفیت دوسری
> تھی۔ممبئی تک ان کی آواز کی گونج تھی۔ایک دو موقعوں پر شمیم سے میرا
> آمنا سامنا بھی ہوا جس کی یاد کبھی دل سے محو نہ ہوگی وہ اس زمانے میں
> جنتا کی لہروں کے اثر میں تھے۔شمیم جس محفل میں ہوتے انکے وجود
> سے وہ زعفران زار بن جاتی۔شام کی نشستیں ان کی موجودگی سے جگمگا
> اٹھتی تھیں۔ جب جب سری نگر جانا ہوتا ایک شام ان کے یہاں ضرور
> گزرتی اور وہ یادگار شام ہوتی۔اصل چیز ان کی امنگ اور ولولہ تھا۔وہ
> کشمیر کے لئے اپنے وطن کے لئے اپنے لوگوں کے لئے بہت کچھ کرنا
> چاہتے تھے۔اورانہوں نے بہت کچھ کیا بھی۔ایسا آدمی خواب دیکھتا

بھی ہے اور دکھاتا بھی ہے۔ایسے خواب جن کی تعبیر نکلتی ہے اور ایسے بھی
جو شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتے۔خوابوں کی یہ دولت ہی شمیم کا سب سے بڑا
سرمایہ تھی۔اور اس کی وجہ سے وہ اپنے دوستوں کے دلوں میں زندہ
رہیں گے۔'' 9

شمیم احمد شمیمؔ ایک ایسی عظیم شخصیت کے مالک تھے جو ان کے ہم عصر صحافیوں یا سیاستدانوں کو حاصل نہ ہو سکی۔شمیم سیاسی، سماجی ،ادبی ،تمدنی ،علمی اور صحافی میدان کے ایک عظیم شخص تھے۔شمیم نے جب'' آئینہ کا جرأ کیا یہی وہ وقت تھا جب کشمیر میں اس میدان میں دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ چند اخبارات تھے جو کہ حکمرانوں کی رائے کے محتاج تھے لیکن اس نوعیت کا یہ پہلا اخبار تھا جو کسی حکمران یا برسر اقتدار جماعت کے زیر سایہ کام نہیں کرتا تھا۔ بلکہ ایک آزاد اور صحافت کے صحیح معنوں کو سمجھنے والا واحد اخبار تھا جس نے اپنی گونج خصوصاً کشمیرو بیرونِ کشمیر کے چپے چپے تک پہنچائی۔یہ ایسی آواز تھی جس میں جزبہ تھا صداقت تھی۔ایک حقیقی آئینہ تھا جو جوں کا توں تصویر اور حقائق کو پیش کرتا تھا اور ساتھ ہی ریاست جموں وکشمیر کی سیاسی سماجی اور ثقافتی دنیا کو بھی منظر عام پر لاتا تھا جو کہ ایک معیاری صحافت کی ایک شاندار اور اعلیٰ مثال ہے۔

شمیم احمد اپنے آپ کو صحافتی دنیا کا سعادت حسن منٹو کہتے ہیں۔شمیم نے جو اپنا خاکہ لکھا ہے،نہایت ہی دلچسپ ہے دراصل ان کا یہ خاکہ عصمت چغتائی کے خاکے سے میل کھاتا ہے۔جس میں عصمت چغتائی نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ لکھا ہے اور نام بھی بڑا دلچسپ ہے'' دوزخی''۔کہا یہ جاتا ہے کہ اس مضمون کو پڑھ کر منٹو کی بیوی نے کہا تھا کہ عصمت کو یہ کیا ہو گیا کہ بھائی پر ایسا عجیب مضمون لکھا۔منٹو نے بیوی کو عجیب وغریب جواب دیا۔'' اگر تم مجھ پر ایسا مضمون لکھ سکو تو قسم بخدا میں ابھی مرنے کو تیار رہوں''۔

یہی وجہ ہے کہ شمیم بھی اپنے آپ کو منٹو سے تعبیر کرتے ہیں۔کیوں کہ شمیم صرف ایک کالم نگار صحافی نہیں تھے اور نہ ہی محظ ایک سیاست دان تھے۔شمیم ایک عمدہ خیالات اور ایک دانشورانہ فکر کے حامل انسان تھے۔شمیم کے دل میں ایک شعلہ تھا جو اسے خاموش نہیں رہنے دیتا تھا۔

آئینہ کو صاحبِ'' آئینہ'' نے صرف سیاسی تبصروں تک محدود نہ رکھا ہفت روزہ'' آئینہ'' صحیح طور پر خبر کا نہیں بلکہ ایک

گہری نظر کا پرچہ تھا۔اس کے تیسرے صفحے پر شمیم احمد شمیم ''چراغ بیگ کے قلم سے'' لکھتے تھے۔اس میں تمام سماجی ،سیاسی، علمی ،اور رسم ورواج کے متعلق تحریر فرماتے تھے۔شمیم احمد کی دانشورانہ مثالوں کی کمی نہیں ہے۔اسی طرح وہ اپنے ایک دانشورانہ مضمون ''تقسیم ملک کے مابعد اثرات'' میں لکھتے ہیں کہ۔

> ''ہندوستانی مسلمان کا مستقبل کیا ہے اسے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا قطعیت کے ساتھ کوئی جواب دینا ممکن نہیں لیکن ایک بات طے ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل خود ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر ہمارا ملک تعلیمی پسماندگی ذہنی پستی اقتصادی بد حالی اور سیاسی افرا تفری کے اس اندھیرے سے باہر نکل کر آگے بڑھنے میں کامیاب ہوا تو ہندوستان کا مسلمان بھی خوشحال اور آسودہ ہوگا کیوں کہ ہندوستان میں مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ نفرت کے لئے جگہ نہیں ہوگی۔اس کے برعکس اگر ہندوستان کی سیاسی قیادت اقتصادی محاذ پر ناکام ہوکر اس ملک سے بھوک ،غربت ،افلاس اور لاچاری مٹانے میں کامیاب نہیں ہوئے تو پچپن کروڑ ہندوؤں کے ساتھ چھ سات کروڑ مسلمان بھی ڈوب جائیں گے۔اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل گہرے طور پر اس ملک کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ انہیں کیا نہیں کرنا چاہئے میں یہ کہ سکتا ہوں۔انہیں کسی قیمت پر بھی کسی فرقہ پرست جماعت کا آلہ کار نہیں بننا چاہئے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے فرقہ پرست سیاست خودکشی کے مترادف ہے اور اسلام میں خودکشی گناہ عظیم ہے۔''[10]

مذکورہ بالا اقتباس سے شمیم کی دانشورانہ صلاحیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس میں وہ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک بہترین رائے سے نوازتے ہیں جو آج کے دور پر بھی صادق آتی ہے۔دور جدید میں جس طرح سے فرقہ وارانہ

جماعت برسرِ اقتدار میں آئی ہیں ان کی نشان دہی شمیم احمد نے آج سے پچاس سال قبل ہی کردی تھی اور یہ مشورہ دیا تھا کہ ایسی جماعتوں سے دور رہنا ہی بہتر ہے ورنہ ''ہم تو ڈوبے تھے صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے'' کے مصداق ہے۔

اخبار آئینہ کی پالیسی۔

''آئینہ'' دراصل ایک ایسے سپاہی کی داستان ہے جس میں جرأت مندی اور بہادری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ شمیم احمد اپنی صحافتی دنیا میں ایک منفرد ستارہ کی حیثیت سے تھے جس کا اپنے دور میں کوئی ہم پلہ نہیں تھا۔ اپنی سیاسی زندگی میں بھی وہ ایک عوامی خدمت کا درجہ دیتے تھے۔ آئینہ کے بارے میں دنیا جانتی تھی کہ یہ بے باک اخبار ہے اور دنیا یہ بات بھی مانتی تھی کہ ''آ ئینہ'' کے سرکردہ صحافی کے اندر بھی ایک طوفان ہے۔ وہ ایک مصلحت یا ایک جنون میں ڈوبے شخص ہیں اور وہ جنون تھا کشمیر کی خوشحالی اور اس قوم کو دلدل سے باہر نکالنا۔ آئینہ کی تحریروں میں ایک کاٹ ہوتی تھی جس کا مقصد اس بگڑے نظام اور بگڑے ماحول کی درستگی تھا جس ماحول اور نظام کا انہوں نے اندرونی اور بیرونی دونوں طرف سے گہرا مطالعہ کیا تھا انہیں اس سیاسی نظام اور اس کے ٹھیکیداروں سے ان کے افعال کی بناء پر ایک عجیب نفرت ہو گئی تھی چونکہ وہ ان کے اندرونی حالات سے اچھی طرح واقف تھے خود لکھتے ہیں:۔

> ''آئینہ'' کا اجرأ میرے لئے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر ہے۔ پچھلے آٹھ برسوں میں میں نے ایک اخبار کے اجازت نامہ حاصل کرنے کے لئے کیا کیا جتن کئے، کتنی منّتیں اور خوش آمدیں کی لیکن جن لوگوں نے فکر اور سوچ پر پہرے بٹھا دئے ہوں انہیں اظہار کی گستاخیاں کیوں کر گوارہ ہو سکتی تھی۔ جہاں اخبار کی اجرأ کی خواہش کو بناوٹ اور غدّاری سے تعبیر کیا جاتا ہو۔ وہاں کس کو یہ جرأت ہو سکتی تھی کہ وہ حرفِ مدعا زبان پر لائے، میں نے کئی بار اس مجنونانہ خواہش کا دبی زبان میں اظہار کیا اپنی وفاداریوں کا یقین دلانے کے لئے کئی مرتبہ اپنے قلم اور ضمیر کا خون کر دیا، ابوجہلوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی روح کو کئی بار زخمی کر دیا لیکن ان کی عیّار نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ

اس خاکستر میں بغاوت کی کچھ چنگاریاں موجود ہیں جو آزادی کی ہوا لگنے سے شعلہ بن سکتی ہیں اس لئے حرفِ مدّ عا جب بھی زبان پر آیا میری زنجیریں اور کس دی گیں۔

مجھے شک وشبہ کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا، مجھ پر الزام عائد کیا گیا کہ میں سوچتا ہوں اور یہ کہ میں بڑے بڑے خواب دیکھتا ہوں، سوچنا تو ایک شعوری فعل ہے میں اس پر پابندی عائد کر سکتا تھا لیکن خواب کا تعلق تو لاشعور سے ہے۔ اس لئے یہ میری گرفت سے باہر تھا میں خواب دیکھتا رہا اور پچھلے گیارہ برسوں میں خواب دیکھنا جرم تھا، خوابوں کے کوتوالوں نے خبر دی کہ شہر میں ایک نوجوان غلط قسم کے خواب دیکھ رہا ہے۔ قصرِ شاہی سے فرمان ہوا کہ اسے شہر بدر کر دو اس پر جینا حرام کر دو اس کی آنکھوں سے نیند اڑا دو تا کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ دوسروں کو عبرت ہوئی یا نہ لیکن خود میری آنکھیں ضرور کھل گئیں۔ خوابیدہ احساس نے کروٹ لی جس شعور کو تھپکیاں دے دے کر سلایا تھا وہ جاگ اٹھا، غلامی اور ذلّت کی چھاؤں میں رہ کر میں اپنی زنجیروں سے کچھ مانوس ہو گیا تھا مجھے یہ زنجیریں بھی اپنا ایک وجود کا حصّہ نظر آنے لگیں تھیں اب ان زنجیروں کا بوجھ نا قابلِ برداشت معلوم ہونے لگا۔ مجھے اپنے ماضی سے نفرت، اپنے حال سے بے اطمنان اور اپنے مستقبل سے وحشت ہونے لگی ہے اور یہ نفرت بے اطمنانی اور یہ وحشت ''آئینہ'' کے اجراٗ کی شان نزول بھی ہے اور میری آٹھ سالہ کشمکش کا حاصل بھی۔''[۱۱]

''آئینہ'' سن ۱۹۶۴ء سے اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ریاست میں کئی نئے نئے اخبارات

جنم لے رہے تھے۔صحافتی دنیا میں ایک انقلاب آ رہا تھا۔سری نگر سے درجنوں ہفت روزہ اور روزنامے شائع ہو رہے تھے۔ ہر کوئی اخبار کی منظوری کے لئے مجسٹریٹ کی دہلیز پہ ڈیرا جمائے ہوئے تھا۔غرض ہر طرف اخبارات کا چرچا تھا۔اسی بھیڑ میں شمیم احمد شمیمؔ بھی شامل تھے لیکن اس بھیڑ میں شمیم ممتاز نظر آتے تھے اس کی وجہ ان کی آٹھ سال کی مسلسل محنت جو اخبار کی منظوری کے لئے کی تھی۔شمیمؔ آخر سن ۱۹۶۴ء میں اس منزل پہ جا پہنچے اور'' آئینہ'' کی منظوری مل گئی عوام کی خدمت کا موقع مل گیا اور شمیم احمد شمیمؔ نے اس اخبار کے ذریعہ عوام کی آواز کو بلند کیا۔شمیم احمد شمیمؔ آئینہ کی پالیسی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

'' آئینہ'' کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے آپ کو اپنی صورت نظر آئے گئی۔اور کچھ دیر بعد آپ کو اس میں اور بھی صورتیں نظر آئیں گیں یہ صورتیں آپ کے ارد گرد کے دنیا کی، آپ کے ماحول کی، آپ کے ماضی و حال اور مستقبل کی سورتیں ہوں گی اور پھر آپ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ کس کا آئینہ ہے؟ یہ کس سیاسی لیڈر کی جائداد ہے؟ یہ کس سیاسی جماعت کا نمائندہ یا نوکر ہے؟ یہ کس رئیس کی کرامت ہے؟ یہ کس سیاسی نظریئے یا مذہبی فرقے کی ترجمانی کرے گا؟ اور بہت سے سوالات ذہن میں ابھریں گے۔ان تمام سوالات کا جواب بھی دیا جاسکتا تھا کہ'' آئینہ'' کا کسی جماعت یا لیڈر سے تعلق نہیں یہ عوام کا اخبار ہے لیکن میں دو وجوہ کی بناہ پر خود اس جواب سے مطمئن نہیں ہوں۔اوّلین یہ کہ یہ بڑا روائتی جواب ہے اور ثانیاً یہ پوری حقیقت بھی نہیں، صحیح ہے کہ عوام کے ہر جائز، صالح اور معقول مطالبے کی کلی حمایت کرے گا لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ سستی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے'' آئینہ'' اعتدال توازن اور صحت مند تنقید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے اپنے یہاں صحافتی تنقید کے معنی صرف حکومت کی نقطہ چینی سمجھا گیا

ہے لیکن جمہوری نظام کی بقاء کے لئے صرف حکومت پر ہی نقطہ چینی کرنا کافی نہیں۔ عوام کو بھی تنقید اور ہدف کا نشانہ بنانا چاہیئے۔ ''آئینہ'' جہاں حکومت کی فرد گزاشتوں کو بے نقاب کرنے میں کوئی دقیقۂ فرد گزاشت نہیں کرے گا وہاں وہ بڑی بے باکی کے ساتھ تعصب، تنگ نظری اور فرقہ پرستی، جہالت اور توہم پرستی کے خلاف بھی جہاد کرے گا، آئینہ کا کام صرف تصویریں دکھانا ہی نہیں بلکہ نئی تصویروں کے خاکے بھی تیّار کرنا بھی ہے یہ اخبار اس نئی نسل کی نمائندگی کرتا ہے جو آزادی کے بعد اس ملک میں پروان چڑھی ہے یہ نئی نسل کسی ایک لیڈر یا سیاسی جماعت کی قیادت قبول نہیں کرتی یہ کسی بندھے ٹِکے نظریۓ کی غلام نہیں بلکہ نئے نظریات کو جنم دیتی ہے۔ سیاست، زندگی، مذہب اور اقتصادیات کے متعلق اس کے کچھ مخصوص نظریات ہیں۔ ہم ''آئینہ'' کے ذریعہ نظریات کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے یہ ہر اس نوجوان کا اخبار ہے جو اس نئی نسل سے تعلق رکھتا ہے ''آئینہ'' کے صفحات روشن خیال، ترقی پسند اور صالح مباحث کے لئے وقف ہیں۔ موجودہ دور میں جب ہر اخبار ایک مخصوص سیاسی جماعت سے متعلق ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک ایسے اخبار کی ضرورت شدّت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی۔ جو سیاسی وابستگیوں سے آزاد ہو کر سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل پر بحث کر سکے۔ مجھے یقین ہے کہ ''آئینہ'' اس ضرورت کو پورا کرے گا۔''[۱۲]

درج بالا تحریر پڑھ کر آئینہ کی پالیسی کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں رہتا اور کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر صاحبِ آئینہ نے کھلے طور پر بات نہ کی ہو۔ دراصل اس اخبار کو منظرِ عام پر لانے کا مقصد ہی یہی تھا کہ عوام کے

مسائل اور عوام کی بات ہو۔ کیوں کہ اس دور کے اخبارات زیادہ تر حکومت کی پاسداری کر رہے تھے۔ جو اقتدار میں بیٹھے لوگ چاہتے تھے وہی اخبارات کی سرخیاں بنتی تھیں اور حکومت جن مسائل پر گفتگو نہیں کرنا چاہتی تھی ان مسائل کو اخبارات بھی بڑی آسانی سے گم کر دیتے تھے۔لیکن اسی سماج میں ایک شخص کو یہ نظام بالکل پسند نہ آیا۔

اس شخص نے جب اس شعبے میں خود کام کیا اور دیکھا کہ اخبارات اور صحافت محظ ایک دھوکہ ہے۔ یہ صحافت کے نام پر دھبہ ہے۔ان کے یہاں غیر جانب داری نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ تو حکومت کے پٹھو بنے ہوئے تھےاور برسرِ اقتدار لوگوں کے ہی اِشاروں پر کام کرتے ہیں۔اوران کی مدّاح کرتے نہیں تھکتے۔اس صحافت کے بگڑے نظام کو درست کرنے کے لئے شمیم احمد شمیم میدان میں آئے۔حکومت اورعوام کو بتایا کہ اخبارات اور صحافت کس کو کہتے ہیں پہلے تو ان کو اخبار نکالنے کی اجازت ہی نہیں مل رہی تھی۔ کیوں کہ وہ لوگ اچھی طرح سے جانتے تھے کہ یہ شعلہ سب کو جلا کر رکھ دے گا اور لوگ حقیقت سے آشنا ہو جائیں گےلیکن ایک طویل عرصے بعد جب ''آئینہ'' کو منظوری ملی تو آئینہ نے اپنی سچائی اور ایمانداری سے اس صحافتی کام کو انجام دیا۔اور کہا کہ یہ اخبار کسی جماعت یا لیڈر سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ عوام کا اخبار ہےاورعوام کے لئے ہے۔

دوسری بات صاحبِ آئینہ نے یہ ظاہر کر دی کہ اخبارات کا مقصد محظ حکومت کی نقطہ چینی نہیں ہوتا بلکہ اخبارات کا مقصد ہراس بات کی نقطہ چینی ہے جس میں عوام کی حق تلفی ہواور حکومت پر بھی بے بنیاد الزامات ہوں ان تمام موضوعات پر اگر چہ وہ عوام کے ہوں یا حکومت کے ہوں کھلی گفتگو ہو سکتی ہے لیکن جمہوری نظام کی بقاء کے لئے صرف حکومت پر ہی نقطہ چینی کرنا کافی نہیں عوام کو بھی تنقید اور ہدف کا نشانہ بنانا چاہئے۔شمیم احمد آئینہ کے چھ سال مکمل ہونے پر لکھتے ہیں کہ۔

> ''موجودہ سیاسی نظام اور معاشی ڈھانچے میں ''آئینہ'' جیسے چھوٹے اخبار کا کسی سیاسی جماعت سیاسی ادارے یا سرکاری امداد کے بغیر زندہ رہنا ایک معجزے سے کم نہیں لیکن عزم صمیم کے ساتھ خلوص نیت بھی شامل ہو جائے تو آج بھی معجزے رونما ہو سکتے ہیں۔''آئینہ کا چھ سال تک زندہ رہنا ایک ایسا ہی معجزہ ہے۔اور مجھے یہ کہتے ہوئے فخر

اورغرور کا احساس ہو رہا کہ'' آئینہ صرف خود زندہ نہیں رہا، اس نے
بہت سے لوگوں کو زندگی کے آداب سکھا کر زندہ رہنے کا حوصلہ بھی دیا۔
روائتی صحافت کے بندھن کو توڑ کر آئینہ نے اردو صحافت میں نئی راہیں
نکالی ہیں۔ اور چھ سال کے مختصر سے عرصے میں اس کی شہرت اور
ہندوستان کی سرحدوں کو پار کر کے پاکستان تک پہونچ گئی۔ پاکستانی
حکومت کی طرف سے اخبارات اور رسائل کی آمدورفت پر پابندی
عائد کرنے سے قبل اس اخبار کی پانچ سو سے زائد کاپیاں پاکستان جایا
کرتیں تھیں اس طرح ہندوستان کا کوئی بھی بڑا شہر ایسا نہ ہوگا کہ جہاں
''آئینہ'' کے پڑھنے والے موجود نہ ہوں۔'' ۱۳؎

آئینہ ایک بامقصد باوقار اور آزاد اخبار کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیتا رہا اور اگر کوئی وقت اایسا آیا ہوتا کہ آئینہ کو جب کسی تنظیم یا سرکاری ادارے کی مرضی کے مطابق کام کرنا پڑتا تو صاحبِ ''آئینہ'' یہ بات بالکل برداشت نہیں کرتے بلکہ اس سے بہتر یہ سمجھتے کہ ''آئینہ'' کو بند کر دیتے۔لیکن کسی کی خوشامد اور مدّاح اور جھوٹی صحافت برداشت نہ کرتے اور یہی ''آئینہ'' کی انفرادیت بھی تھی جو اس کو باقی اخبارات سے ممیز کرتی ہے۔''آئینہ'' نے جتنی بھی زندگی پائی، وہ ایک مجاہدانہ زندگی پائی۔ ہمیشہ یہ اخبار ظلم، ناانصافی، تعصب، تنگ نظری، رجعت پسندی اور قدامت پسندی کے خلاف اپنی اواز بلند کرتا رہا۔آئینہ جب اپنی جوانی کے دنوں میں پہنچا تو کچھ لوگوں نے شمیم احمد شمیمؔ سے گلہ کیا کہ ''آئینہ'' میں اب وہ شدّت او جزبہ باقی نہیں رہا جو لوگوں کو گرما کر جذبات کا ایک طوفان برپا کر دیتا تھا۔اس پر شمیم احمد شمیمؔ نے لکھا کہ۔

''فرد کی شخصیت کی طرح اخبار کی شخصیت بھی ارتقاء کے
مراحل سے گزرتی ہے اور بچپن کی شوخیاں او شرارتیں، ایک خاص عمر
تک ہی بھلی لگتی ہیں۔ آپ کا ''آئینہ'' اب رفتہ رفتہ اب جوانی کی
سرحدوں میں قدم رکھنے لگا ہے۔ یہاں اب متانت، سنجیدگی، توازن،

> اور ٹھہراؤ کی ضرورت ہے۔اور مجھے خوشی ہے کہ گزشتہ دو برسوں کے دوران'' آئینہ'' کے اسلوب اور اپروچ دونوں ہی میں ایک صحت منداور خوش گوار تبدیلی رونماء ہوئی ہے۔اور ''ائینہ'' جزبات گرمانے کے ساتھ ساتھ فلکر کی قندیلیں بھی روشن کرنا چاہتا ہے۔تا کہ ذہن کی روشنی اور جذبات کی آنچ ،شخصیت کی تشکیل اور تعمیر میں ایک دوسرے کے مددگار ثابت ہوں۔''[۱۴]

آئینہ ہفت روزہ نے کل گیارہ سال اپنی خدمات انجام دیں۔ایک بے باک اخبار کا اپنے حریفوں کے بیچ اپنی بہادری اور پابندی سے اپنے اصول وضوابط کے ساتھ خدمات انجام دینا بڑی بات ہے۔ ۱۹۷۵ء تک ریاست کی سیاست اور سماجی ماحول میں ایک انقلاب آ گیا تھا جس میں آئینہ کا ایک اہم رول رہا ہے۔آئینہ کی تحریروں کا نتیجہ تھا کہ کشمیری نوجوان اور کشمیر کی نئی نسل کو حقائق سے آشنا کرایا۔اور ایک کامیابی کی ڈگر تک پہنچایا۔اب جب بھی کشمیر کی سیاسی اور صحافتی تاریخ لکھی جائے گی تو مورخوں کو قدم قدم پر'' آئینہ'' کی ضرورت محسوس ہوگی۔ایک چھوٹا اخبار ہونے کے باوجود بڑے بڑے اخبارات سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔آئینہ کو ہمیشہ سنجیدگی سے سنا جاتا رہا ہے اور اپنی گیارہ سالہ زندگی میں نوجوانوں اور دانشوروں کی پوری نسل کو متاثر کیا۔

****

روزنامہ آئینہ ۔

۱۳ اگست ۱۹۷۵ء میں آئینہ ہفت وار آئینہ سے روز نامے میں تبدیل ہوا۔اور پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا۔ ہفتہ وار آئینہ میں چراغ بیگ کی جگہ کوہ کن نے سنبھال لی۔ چراگ بیگ کے نقش وقدم پر چل کر کوہ کن نے بھی اہم اور سنجیدہ موضوعات کے علاوہ آئے دن کے واقعات وحادثات کو بڑی بے باقی سے پیش کرنے کی کوشش کی روزنامہ ''آئینہ'' میں ش،احمد کے نام سے بصیرت افروز کالم اور اداریے لکھے جاتے تھے۔ ہفتہ وار آئینہ اور روزنامہ آئینہ اپنے مزاج،کردار،اور مقاصد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔

روز نامہ آئینہ ہفت روزہ آئینہ سے ہر لحاظ سے الگ تھلگ تھا۔ ہفت روزہ آئینہ کی طرح روز نامہ آئینہ کی اشاعت بہت زیادہ تعداد میں نہیں ہوا کرتی تھی۔روز نامہ آئینہ کو اخبار سے جریدہ کہنا بہتر ہے اگر چہ اس کے اثرات بہت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے کیونکہ اس اخبار میں ادبیّت بہت کم تھی اور اس کا مقصد تھا کہ پڑھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ خبریں فراہم کرے،روز نامہ میں صاحبِ آئینہ اپنے پڑھنے والوں کو نئی نئی شخصیات سے آشنا کراتے تھے لیکن روز نامہ آئینہ میں کاروباری اشتہارات نے ان شخصیات کی جگہ لے لی تھی اسی لئے اس میں صاحبِ آئینہ کا عکس دیکھنے کو بہت کم ملتا ہے اور سماج کی نفسیات پوری پوری دکھائی دیتی ہے۔شمیم احمد شمیمؔ کا اپنا کہنا ہے کہ۔

> ''ہفت روز ''آئینہ'' میرا اخبار تھا اور روز نامہ ''آئینہ'' تمہارا اخبار ہے۔اپنی شخصیت کو آپ کی شخصیت میں مدغم کرنے کا فیصلہ میرا ذاتی فیصلہ تھا۔اور اس میں کسی مجبوری یا کسی مصلحت کا دخل نہیں تھا۔میں اپنی ذات کے حصار کو توڑ کر کائنات میں گم ہونا چاہتا تھا۔'' ۱۴

اپنے ہم عصر اخباروں میں راوزنامہ آئینہ کا شمار بھی اہم تھا جس کی باقی اخباروں سے کوئی امتیازی شان نہیں تھی۔عام اخبارات کی طرح روزانہ کی خبریں چھپتی تھی ۔شخصیات کی جگہ کاروباری اشتہارات آگئے تھے۔ چراغ بیگ کی جگہ کوہ کن نے سنبھال لی۔ چراغ بیگ کے نقش وقدم پر چل کر کوہ کن نے بھی اہم اور سنجیدہ موضوعات کے علاوہ آئے دن کے واقعات وحادثات کو بڑی بے باقی سے پیش کرنے کی کوشش کی۔لیکن ہفت روزہ

آئینہ کی ادبیت کالم نگاری، اداریہ نگاری اور خاکہ نگاری کی عظمت نصیب نہ ہوسکی اور روزنامہ کی خبروں میں شمیم احمد شمیمؔ کا متفق ہونا بھی ضروری نہیں تھا۔ دراصل اگر صاف الفاظ میں کہا جائے تو روزنامہ آئینہ زمانے کی نظر ہو گیا تھا۔ جس میں روایت سے بغاوت کی ہمت پست ہو گئی تھی۔ اور زمانے کی پیروی کرنا شروع ہو گئی تھی، ایسا لگتا ہے روزنامہ ''آئینہ'' اب بڑھاپے کی زندگی کاٹ رہا ہے اور شمیم احمد شمیمؔ نے بھی زمانے کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ شمیم احمد شمیمؔ نے آئینہ کو ہفت روزہ سے روزنامہ میں تبدیل کر کے اپنی زندگی کے گھٹتے دِنوں کی طرح آئینہ کے دن بھی گھٹا دئے دراصل یہ فیصلہ بھی سماج اور سیاسی سازشوں سے تنگ آ کر شمیم احمد شمیمؔ نے کیا تھا خود لکھتے ہیں کہ۔

> ''آئینہ' کو روزنامہ بنانے کا فیصلہ میں نے آج سے ایک سال قبل اس وقت کیا تھا کہ جب پورے ملک کی صحافت پر ایمرجنسی کے گہرے اور کالے بادل منڈلا رہے تھے اور تحریر و تقریر کی آزادی اس درجہ محدود کر دی گئی کہ سانس لینا بھی مشکل تھا یہ وہ وقت تھا کہ جب بہت سے کامیاب اخبارات گھٹ گھٹ کر مر رہے تھے اور جو زندہ تھے وہ مردوں سے بھی بدتر، ان حالات میں ہفت روزہ کو روزنامہ بنانے کا فیصلہ بہت سے لوگوں کی طرح مجھے بھی کچھ عجیب سا لگا لیکن اس کے باوجود میرے لئے یہ عجیب سا فیصلہ بہت ضروری بن گیا تھا۔ اس لئے میں نے نہایت ہی مخدوش حالات، میں یہ غیر متوقع قدم اٹھایا۔۔۔۔ اس فیصلے پر مجھے شرمندگی محسوس نہیں ہوتی۔'' ۱۵

روزنامہ ''آئینہ کو شمیم احمد شمیمؔ نے دوسرے اخبارات سے مختلف کرنے کی بے انتہا کوشش کی ہے کہ کہیں اس کے دامن میں بازاری صحافت اور لوچ قسم کی تحریریں شامل نہ ہو جائیں۔ شمیم احمد نے صحافتی دیانت داری اور شرافت کی قدروں کا دھیان رکھنے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ کس حد تک کامیاب ہوئی وہ تو روزنامہ ''آئینہ ہی بتاتا ہے یہ بات الگ ہے کہ صاحبِ آئینہ نے اس کے معار کو برقرار رکھنے کے لئے بہت کوشش کی اگر چہ وہ اہمیت برقرار

نہ رہ سکی۔ بازاری خبروں سے اور اخلاق سوز خبروں سے بچنے کی کوششیں بھی ہوتی رہیں اور جب کبھی غیر ارادی طور یا سہواً عملے کے کسی فرد کی لاپرواہی سے کوئی چیز خبر یا مراسلہ شائع ہو جاتا تو فوراً ہی اس پر ندامت اور شرمندگی کا اظہار کر کے اس کی تلافی کرنے کی کوششوں کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ کہ جیسے سری نگر کے ایک آرٹسٹ کے خلاف روزنامہ ''آئینہ'' اخبار میں ایک غلط بے بنیاد اور سنسنی خیز خبر شائع ہوئی تھی۔ صحیح حالات معلوم ہونے پر ادارہ نے اس کی تردید کی اور اور شمیم احمد نے ذاتی طور پر اس آرٹسٹ سے اس زیادتی اور ناانصافی کے لئے معافی مانگی بعض مقامی اخبارات کے لئے جرائم کی خبریں باقاعدہ ایک تجارت کے طور پر تھیں اس لئے'' آئینہ'' کا عملہ بھی شمیم صاحب کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اس طرح کی جرائم اور جنسی خبریں شائع کرنے میں گریز نہ کرتا۔ اور پھر اس طرح کی تمام ناشائستہ تحریروں کی ذمہ داری انہیں کو قبول کرنی پڑتی اور بار بار اپنے عملے سے یہ تاکید کرتے کہ ان چیزوں سے بچا کرو اور ان خبروں کو پیش نہ کیا کرو یہ ہمارے ادارے کے خلاف ہے۔

اگر چہ آئینہ اپنے سیاسی نظریات، بے لاگ تنقید، اور بے خوف اظہارِ رائے کے اعتبار سے جانا جاتا تھا۔ جو اب روزنامہ'' آئینہ'' کی وجہ سے ماند پرتی جا رہی تھیں۔ ہاں بات الگ ہے کہ اس کے اڈیٹوریل پیج اور اشتہارات کو سیاسی سرکاری اور ادبی حلقوں میں خصوصی توجہ کے ساتھ پڑھا جاتا رہا ہے۔ دوسرے اخبارات سے روزنامہ آئینہ پر زیادہ بھروسہ کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ وہ آئینہ نہیں تھا جو شمیم احمد شمیم کے ذہن اور خوابوں کا آئینہ تھا یہ اس آئینہ سے کوسوں دور ہوتا ہوا چلا جا رہا تھا اس کے پیچھے بہت ساری وجوہات ہیں۔ اس کی بڑی وجہ شمیم صاحب بتاتے ہیں کہ۔

> ''مجھے اس بات کا احساس ہے کہ آئینہ ابھی میرے ذہن اور میرے خوابوں کا آئینہ نہیں بن سکا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں جن میں بڑی وجہ یہ ہے کہ 16 جون 1975ء کو ملک میں نافذ ہونے والی ایمرجنسی ہے جس نے تحریر و تقریر پر ایسی ایسی تعزیریں عائد کر دیں ہیں کہ جن کی موجودگی میں قلم کو سیاہی میں ڈبوتے ہوئے بھی جرم کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم نے پچھلے ایک سال کی اشاعت کے

دوران حتی المقدور اورحتی الامکان   ایمرجنسی کے قواعد وضوابط اور
احترام کرنے کی کشش کی ہےلیکن بار ہاغیرارادی اورغیرشعوری طور پو
ہمارے قلم سے ایسی بھی گستاخیاں سرزدہوئیں کہ جس سے اربابِ ایمر
جنسی کے ماتھے پرشکنیں نمودار ہوگیں۔ میرے دفتر کی میز پر درجن
سے زائد ایسے حکم نامے اور ہدایت نامے موجود ہیں کہ جن پر میری
گستاخیوں اورشوخیوں کے لئے مجھے تنبیہ کردی گئی ہےاوران کو دیکھ کر
مجھے یہ شعریاد آتا ہے۔

جب نام ترا لیوےتب چشم بھرآوے
اس زندگی کرنے کوکہاں سے جگرآوے   ''۱۶

اس طرح'' آئینہ'' روزنامہ نے بھی ایک قلیل زندگی پائی۔اوراس دوران مختلف حالات سے گزرتا رہااورصاحبِ آئینہ کوبھی کینسرکی بیماری نے جکڑ لیا۔ بیماری کی وجہ سے وقت بھی نہیں دے پاتے تھےاور جب کام دوسروں سے ہاتھوں انجام ہونے لگا تو اس کی وقعت اورشہرت میں بھی گراوٹ لازمی تھی۔آخرسن 1878ء میں روزنامہ آئینہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔اس کے قاریوں کو یہ انتظارتھا کہ شمیم احمد شمیمؔ صحت یاب ہوجائیں تو دوبارہ آئینہ ہمارے ہاتھوں میں آجیئے گا لیکن ایسا ہوانہیں اوروہ انتظارآج تک ختم نہیں ہوا۔

شمیم احمد شمیمؔ کی خاکہ نگاری۔

خاکہ وہ تحریرہےجس میں خاکہ نگارکسی انسان کی شخصیت کےمختلف پہلوؤں کواس طرح اجاگرکرے کہ وہ شخصیت قاری کوایک زندہ شکل میں نظرآئے اورخاکہ نگارنے اس انسان کی زندگی کا جس قدرمشاہدہ کیا ہوغیر جانب داری سے اس سے متعلقہ حالات وواقعات کوقاری کے مطالعہ میں لےآئے۔خاکہ اسکیچ سے بڑی اورآگے کی چیز ہے۔اس میں خاکہ نگارکسی شخص کے ظاہری نقوش،خدوخال،چہرےاورحُلیے کے مشاہدے کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کی باطنی پرتیں بھی ٹٹولتا ہےاوراپنے ذاتی تاثرات بھی پیش کرتا ہے۔کسی شخصیت کا خاکہ بیان کرتے وقت اس کی ہوبہوتصویرکشی کی جاتی ہےاورمعروضی انداز سے کام لیا جاتا ہے،نیزاس کی خوبیوں کے ذکرکے ساتھ

ساتھ اس کی خامیوں کو بھی اجاگر کیا جاتا ہے۔ایک اچھا خاکہ وہی سمجھا جاتا ہے جس میں صاحبِ خاکہ کی شخصیت جیسی کہ وہ ہے ابھر کر سامنے آجائے خواہ وہ اس کا حلیہ اور لباس ہو یا وضع قطع ہو، عادات واطوار ہوں یا اندازِ گفتگو اور مزاج ہو۔اس شخصیت کے ساتھ پیش آنے والے بعض حالات وواقعات بھی خاکہ نگاری میں دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض خاکے سوانح نگاری اور سیرت نگاری کی حدوں کو چھو لیتے ہیں

خاکہ نگاری میں جب لکھنے والا کسی شخص کو موضوع بناتا ہے تو واقعات اور سوانحی، خارجی مشاہدات کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات اور قیاسات سے بھی مدد لیتا ہے اسی لئے خاکہ ایک جیتی جاگتی حقیقی شخصیت کی تصویر ہوتے ہوئے بھی افسانے جیسی دلکشی اور دلچسپی کا سامان رکھتا ہے اور پڑھنے والا ایک واقع کے طور پر بھی پڑھتا ہے۔ چنانچہ ایک کامیاب خاکہ جو اس صنف کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو ہماری فکر اور ہمارے احساسات دونوں سے رشتہ قائم کرتا ہے۔اچھا خاکہ بھی وہی شخص لکھ سکتا ہے جو غیر معمولی طور پر ذہین حسّاس باشعور، دانشور، انسان دوست اور انسانی نفسیات کا ماہر ہونے کے ساتھ فکر وشعور میں بھی بالیدگی ہو۔ان تمام تر صفات سے پُر شمیم احمد شمیمؔ بھی ایک اعلیٰ پایہ کے خاکہ نگار تھے۔شمیم احمد کا گہرا سماجی شعور اس بات کی مکمل دلیل ہے کہ آپ ایک بہترین خاکہ نگار بھی تھے۔تخلیقی جوہر کے مالک شمیم کو زبان پہ غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ بلکہ صاحب طرز شخص تھے۔شمیم نے اپنی خاکہ نگاری کہ ذریعہ بہت ساری شخصیات کو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ اس کی شخصیت اور احترام کو بھی باقی رکھا ہے۔ تمام خرابیوں کے باوجود بھی اس شخصیت سے ہمدردی اور خوبیاں نظر آتیں ہیں۔ شمیم احمد کی شخصیت سے کون شخص متاثر نہیں ہوتا تھا ان کی سوچ میں کشمیر اور اس کی فلاح و بہبودی ہی سب کچھ تھی ان کی سوچ ہمیشہ سے ہی یہ رہی ہے کہ کشمیر اور اس میں رہنے والے لوگ کس طرح ایک کامیاب قوم بن جائے انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ہمیشہ یہی پیغام دیا۔شمیم صاحب نے جس طرح خاکے لکھے ہیں۔یقیناً ان خاکوں کا شمار اردو ادب کے بہترین خاکوں ہیں ہوتا ہے جیسے کہ انہوں نے شیخ عبداللہ کا خاکہ لکھا ہے اس کا ایک اقتباس پیش ہے:۔

"لیکن ایک بات جس پر ان کے دوست دشمن سبھی متفق ہیں وہ ہے
ان کی حب الوطنی، انہیں کشمیر سے بے پناہ عشق ہے وہ کشمیر کی خاطر
ساری دنیا کی بادشاہی کو بھی ٹھکرا سکتے ہیں اور ان کی ساری زندگی اس

عشق کی تفسیر ہے یہ ان کی بہت سی کمزوریوں اور نامرادیوں کا منبع بھی
ہے اور ان کی بے پناہ قوّت کا خزینہ بھی ۱۹۳۱ء کی صبح سے لے کر ۱۹۶۹ء
کی شام تک ان کی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب کیجئے تو اندازہ
ہوگا کہ ان کی ہر سانس کشمیر کے غم اس کے دکھ درد اور اس کی خوشبو سے
عبارت ہے اور یہی خصوصیت انہیں دیگر کشمیری رہنماؤں سے بلند اور
ممتاز کرتی ہے شیخ صاحب کی فتوحات کی فہرست مرتب کیجئے یا ان کی نا
کامیوں کی تفصیلات۔ ہر عنوان کے تحت کشمیر سے ان کی بے پناہ محبت
اور عقیدت کا احوال مل جائے گا۔''۱۷

شمیم احمد شمیمؔ کی تحریریں اور گفتگو دونوں ہی میں کشمیر کا ذکر ضرور پایا جاتا ہے۔ شمیم احمد شمیمؔ جب بھی گفتگو کرتے تو کشمیر کی اقتصادی، تعلیمی، اور سماجی حالات کے بارے میں ضرور ذکر کرتے۔ شمیم احمد جیسے بہت کم لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جو اپنے وطن عزیز سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے نہایت ہی خلوص اور محبت سے وطن کی آبیاری کی، اور یہی ان کا مقصد حیات تھا۔ کشمیر کی عوام کے حق میں شمیم احمد شمیمؔ بہت لڑے اور موقع بے موقع کشمیریوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ذکر ضرور کرتے تھے انہوں نے جو باتیں شیخ صاحب کے تعلق سے لکھیں ہیں۔ وہ خود ان پر پوری پوری اُترتیں ہیں۔

ایک اچھا خاکہ لکھنے کے لئے خاکہ نگار میں جو صلاحیتیں ہونی چاہیں وہ سب ان میں موجود تھیں۔ شمیم احمد شمیمؔ ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک اعلیٰ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین صحافی بھی تھے اگر اردو صحافت کی تاریخ ایمان داری سے لکھی گی تو شمیم احمد شمیمؔ کا نام ان صحافیوں کی صفِ اوّل میں لکھا جائے گا انہوں نے خود صحافت میں ممتاز ترین مقام بنایا ہے۔ شمیم ایک اعلیٰ ذہانت کے مالک تھے۔ کشمیر اور پورے ہندوستان کی سیاست پر جن چند لوگوں کی بہت گہری نظر تھی، ان میں شمیم احمد صاحب بھی شامل تھے۔ کم عمر ہونے کے باوجود شمیم احمد شمیمؔ سیاست کے تمام اتار چڑھاؤ کو اچھی طرح جانتے تھے اور سیاست میں سیاسی کھیل کھیلنے والوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہیں جو اردو لکھنے کا سلیقہ تھا وہ کم لوگوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ اپنے ان بزرگ ہم عصروں کو جو دنیا سے

چل بسے ہوں، خاکہ لکھنا نسبتاً آسان رہتا ہے۔ بعض خاکہ نگاران شخصیتوں کو اپنے طنز و مزاح کا ہدف بناتے ہیں۔ اور ان کے بارے میں انتہائی مضحکہ خیز باتیں بھی کرتے ہیں۔ مرحومین کے بھی خاکے لکھے جا سکتے ہیں اور ایسی صورت میں خاکہ نگار سے کوئی جواب طلب کرنے والا یا جھگڑا کرنے والا نہیں ہوتا ہے۔

اس ضمن میں خلیق انجم لکھتے ہیں:۔

''رفتگاں کا خاکہ لکھنے والے کی مثال ایک ایسے شکاری کی ہوتی ہے جو ایک کمین گاہ میں چھپ کر شیر پر گولیاں چلاتا ہے۔ ایسی صورت میں شیر گولی چلانے والے کو جواب نہیں دے سکتا۔ اس کی مثال ایک ایسے پہلوان کی بھی ہے۔ جو اپنے دشمن کے ہاتھ پیر بندھوا کر ڈال دیتا ہے۔ اور اس بندھے ہوئے انسان پر مُکوں اور لاتوں سے اپنی طاقت کا اظہار کرتا ہے۔ اور پھر داد طلب نگاہوں سے ناظرین کی طرف دیکھتا ہے''۱۸؎

اس طرح معاصرین کا خاکہ لکھنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ کیوں کہ خاکہ نگار جو کچھ لکھتا ہے اس کے ایک ایک لفظ کا اس کو جواب دینا پڑتا ہے۔ جس شخص کا خاکہ لکھا گیا ہے وہ جواب مانگتا ہے اور اگر صاحب اقتدار ہے تو خاکے میں سچی اور تلخ باتیں کہنے کا جواب اپنے اقتدار اور قوّت کے ذریعہ دیتا ہے۔

جیسا کہ شمیم احمد شمیمؔ کے ساتھ پیش آیا بعض اوقات جس کا خاکہ لکھا گیا ہے اس کے ہمدرد اور مدّاح بھی جواب طلبی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ شمیم احمد نے دو سال مکمل پابندی کے ساتھ کشمیر کی سیاسی اور چھ ادبی شخصیتوں کے خاکے لکھے اگر چہ ان شخصیات کا تعلق کشمیر سے ہی تھا لیکن صرف کشمیر ہی میں نہیں بلکہ کشمیر سے باہر بھی خاکوں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ شمیم احمد شمیمؔ نے جن لوگوں کے خاکے لکھے ہیں ان کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں میں تھا ان میں اہم اور غیر اہم سیاسی لیڈروں کے علاوہ سرکاری ملازم، صحافی، اور ادیب سبھی طرح کے لوگ شامل تھے۔ شمیم احمد شمیمؔ کی کوشش تھی کہ وہ ایسے لوگوں کے خاکے لکھیں گے جو سیاسی سماجی اور ادبی زندگی میں اپنے لئے کوئی مقام بنا چکے ہیں اور جو کہ سیاسی سماجی اقتصادی تعلیمی اور ادبی زندگی کے بہاؤ کی سمت متعین کرتے

ہیں۔سمت اگر چہ کوئی بھی ہو اچھی ہو یا بری انہوں نے چھوٹے اور بڑے بہتر اور بدتر اقتدار اور غیر اقتدار کسی میں کوئی فرق نہیں کیا انہیں جس کی شخصیت نے متاثر کیا اس کا خاکہ لکھ دیا۔شمیم احمد شمیمؔ نے شخصیت کی بلندی یا پستی نہیں دیکھی انہوں نے یہ دیکھا کہ کون کیسا ہے جس کی شخصیت کے مثبت پہلو یا منفی پہلو انسانی سماج کو متاثر کرتے ہیں اور اسی پر شمیم احمد شمیمؔ نے خاکہ لکھا ان کے یہاں جانب داری نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ان کا قلم سچ اور حق لکھنا ہی جانتا تھا۔اسی وجہ سے ان کے قلم کی تاثیر اتنی بہتر تھی۔

1969ء میں شمیم احمد شمیمؔ نے ''آئینہ'' کا شخصیات نمبر شائع کیا تھا۔جس میں چونتیس خاکے شامل تھے۔یہ سب خاکے شمیم احمد شمیمؔ کے قلم سے لکھے گئے تھے۔اس میں وہ خاکے بھی تھے جو پہلے ہفت روزہ ''آئینہ'' میں شائع ہو چکے تھے اور کچھ ایسے خاکے بھی تھے جو انہوں نے اس خاص نمبر کے لئے لکھے تھے۔شمیم احمد شمیمؔ ایک سچے اور ایماندار شخصیت کے حامل تھے۔انہوں نے اپنی خاکہ نگاری میں بھی سچائی اور ایمانداری سے کام لیا۔خود لکھتے ہیں کہ۔

> ''یہ خاکے سوانح حیات سے تعلق رکھتے ہیں اور انہیں عدالتی فیصلوں کا ان میں افراد کے کارناموں اور زیادہ ان کی شخصیات اور کردار کی نمایاں خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کو میری نگاہ میں عناصر ترکیبی کی حیثیت حاصل ہے۔اور ظاہر ہے کہ اس میں میری پسند اور ناپسند کا بڑا عمل دخل رہا ہوگا۔میں نے جو کچھ لکھا ہے ایمانداری سے لکھا ہے لیکن ایمانداری بھی ایک اضافی قدر ہے اور اس لئے مجھے اس کا دعویٰ نہیں کہ ہر فرد کے متعلق میری رائے بالکل صحیح اور میرا تجزیہ بالکل ایماندارانہ ہے ہوسکتا ہے کہ بعض شخصیات کے بارے میں میں نے ذہنی تشدّد کا مظاہرہ کیا ہو اس کے بہت سے سیاسی اور نفسیاتی اسباب ہیں۔1964ء سے 1965ء تک کا زمانہ میرے لئے بغاوت برہمی اور بیزاری کا زمانہ تھا اور میں ہر اس بت کو توڑنے کے لئے کوشاں تھا کہ جس کو بخشی صاحب کے دورِ استبداد میں اقتدار

> کے مندر میں جگہ مل گئی تھی اوراس کے لئے اس دور کی بہت شخصیات
> کے متعلق میرا ردّیہ بے حد جارحانہ بلکہ دشمنانہ تھا لیکن بعد کے واقعات
> نے ثابت کر دیا کہ نئے دور کے فرعون پرانے دور کے فرعونوں سے
> زیادہ مختلف نہیں ان میں صرف اسٹائل کا فرق ہے۔'19

شمیم احمد شمیمؔ نے جن لوگوں کے خاکے لکھے ہیں۔ مثلاً شیخ محمد عبداللہ خواجہ غلام محمد صادق، مرزا افضل بیگ مولانا مسعودی سیّد میر قاسم وغیرہ حضرات شامل ہیں اوران کے علاوہ دوسرے درجے کے ایسے سیاست دان بھی جو غیر معروف تھے ان میں مختار صاحب، زتشی صاحب، تپ جی ،شیونرائن، فوطیدار کار صاحب ،موتی لال مصری صاحب ان کے علاوہ شمیم صاحب نے کشمیری اوراردو کے شاعروں کو بھی خاکے لکھے ہیں ان میں بنسی نردوش، حاجنی صاحب اور دینا ناتھ نادم وغیرہ ہیں۔ غلام رسول سنتوش کشمیر کے ایک اہم مصوّر تھے ان کا بھی خاکہ لکھا ہے۔ شمیم احمد نے سیاسی راہنماؤں سرکاری ملازموں اخبارنویسوں ادیبوں اور شاعروں کے خاکے بھی لکھے جن شخصیتوں نے منفی اور مثبت دونوں انداز میں ان کے ذہن کو متاثر کیا اس کا انہوں نے خاکہ لکھا ہے۔

شمیم احمد شمیمؔ ایک صحافی تھے اور ایک سیاست دان بھی تھے سیاسی شخصیات جیسے شیخ صاحب یا بخشی صاحب سے بہت قریب رہے ہونگے اور خود ان کا مزاج ایسا تھا کہ وہ ہر وقت باغیانہ باتیں کرتے تھے اور پھر ان کا معار اتنا بلند تھا کہ اس پر بہت کم لوگ پورا اُتر پاتے تھے چونکہ ان میں قوّت برداشت نہیں تھی اسی عالم میں بض اوقات وہ گستاخی کی حدیں بھی پار کر جاتے تھے۔ ان کی شخصیت متنازہ تھی وہ دوسروں کے بارے میں سچی باتیں تو کہا ہی کرتے تھے مگر اپنے بارے میں بھی سچ بات کہنے سے زرا نہیں کتراتے تھے یہی وجہ تھی جو باقی ادیبوں اور صحافیوں سے شمیم کو الگ کرتی ہے انہوں نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے بالکل پورا پورا سچ اور مزے لے لے کر لکھا ہے ان کا اپنا خاکہ پڑھنے کے لائق ہے وہ اپنے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''''وہ بڑا بے ایمان ہے''''وہ ایک نمبر کا فراڈی ہے''''وہ
> باتوں کا سوداگر ہے'' ''وہ بڑا منہ پھٹ اور گستاخ ہے'' شمیم احمد
> شمیمؔ کے متعلق بہت دیر تک ایک ہی رائے پر قائم رہنا زرا مشکل ہے

اس کی شخصیت بیک وقت اتنی متضاد اور مختلف کیفیات کی حامل ہے اس کا مطالعہ کرنے والے کو ہر قدم پر اپنی رائے میں ترمیم و تصیح کی ضرورت محسوس ہوگی۔ میں اس کے بارے میں جو کچھ کہوں گا وہ اس حد تک صحیح ہے کہ اس کے خاکے کے مکمل کرنے تک میری اس کے متعلق رائے ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کے مکمل ہونے کے فوراً بعد مجھے یہ احساس ہوجائے کہ یہ ہر لحاظ سے نامکمل ہے۔'' ۲۰

شمیم نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایمانداری اور سچائی کی ایک بہترین مثال ہے کیوں کہ ایک شخص اپنے دشمن کے بارے میں بھی لکھنے پر ضرور سوچتا ہے لیکن انہوں نے نہایت ہی بے باقی سے اپنے احوال اپنے خاکے میں نقل کیے ہیں آگے لکھتے ہیں۔

ان دِنوں شمیم احمد بخشی صاحب کی ناک کا بال تھے۔ بخشی غلام محمد کی سیاسی بدعنوانیوں کے لئے اخلاقی جواز تراشنا، ان کی زیادتیوں کو سیاسی جنگ کی اخلاقیات قرار دینا ان کی خامیوں کو علمیت کا معار ثابت کرنا اور ان کی ذات کو کشمیر کی نجات سے تعبیر کرنا شمیم صاحب کا بہترین مشغلہ تھا ان ہی دنوں بخشی اور صادق کشمکش اپنے نقتہ عروج پر تھی۔ اور بخشی صاحب نے صادق صاحب کی اینٹوں کا جواب پتھروں سے دینے کے لئے "حقیقت" نام کا ایک ہفت روزہ جاری کر دیا تھا۔

آگے مزید لکھتے ہیں۔

''ایک روایت کے مطابق صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں کے خلاف ہفت روزے میں جتنی دشنام طرازی ہوا کرتی تھی۔ وہ سب شمیم صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہوا کرتی تھی اور شمیم صاحب اپنی وفاداریوں کا یقین دلانے اور ان کا معاوضہ حاصل کرنے کے لئے بخشی

صاحب کے مخالفوں پر پہلو سے وار کا کرتے تھے۔بعض سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ ''ترقی پسندوں" کی منظّم جماعت کلچرل کانگریس میں انتشار اور پھوٹ پیدا کرنے کا کارنامہ بھی ان ہی کے ہاتھوں انجام دیا گیا۔شمیم صاحب کی ان ہی خدمات کے عوض میں انہیں سرکاری جیپ کا ناجائز استعمال کرنے کی مکمل اجازت دی گئی تھی۔ پھر ایک دن خبر آئی کہ بخشی غلام محمد کو شمیم صاحب کی وفاداریوں پر شبہ ہو گیا ہے۔کافی ہاؤس اور کئی مقامات پر شمیم نے کچھ ایسی باتیں کہیں ہیں جن سے بغاوت اور نافرمانی کی بو آتی ہے اور بخشی صاحب شمیم صاحب سے بے حد ناراض ہیں۔شمیم صاحب سے ان کے سرکاری جیپ بھی چھین لی گئی اور وہ مستعفی ہو کر علی گڑھ کو روانہ ہو گئے"۲۱

اکثر لوگ اخبارات اس لئے نکالتے ہیں کہ ایک تو شہرت کے متلاشی ہوتے ہیں اور دوسرے ذاتی پبلیسٹی مقصد ہوا کرتا ہے۔لیکن شمیم احمد شمیمؔ ان باتوں سے دور تھے انہوں نے ایمانداری اور کھلے دل سے اس کا اعتراف کیا ہے۔انہوں نے خاکے میں اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے جو اپنے مخالفین سے خائف نہ ہو خود لکھتے ہیں:۔

''اس میں تعمیر کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں لیکن اس نے اپنی تمام قوّتیں تخریب میں صرف کر رکھی ہیں۔ وہ سیاسی دنیا کا سعادت حسن منٹوؔ ہے جو چونکا دینے پر یقین رکھتا ہے۔آپ شمیم سے نفرت کر سکتے ہیں اس کو گالی دے سکتے ہیں لیکن آپ اسے نظر انداز نہیں کر سکتے وہ اپنی شخصیت کو منوانے کا گُر جانتا ہے۔جب وہ اسمبلی کا ممبر بن گیا ہے اس نے اپنے اخبار'' آئینہ'' کو اپنی ذات کا اشتہار بنا دیا ہے اور اسی لئے مشہور اردو مصنف ظ انصاری، نے آئینہ کو شمیم کی ذہنی صحت کا بلیٹن

یاان کی ''صحیح بخاری'' قرار دیا ہے۔عام لوگ '' آئینہ'' کوشمیم گزٹ اور شمیم نامہ کے نام سے بھی یاد کرتے تھے۔ کیوں کہ پچھلے دو تین سال سے اس میں شمیم صاحب کی تقریریوں ان کی مصروفیات اور ان کے لطائف کے علاو کچھ نہیں ہوتا۔شمیم صاحب میں اچھا ادیب بنے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔لیکن ادب چونکہ زیادہ ریاض لگن اور توجہ چاہتا ہےاس لئےشمیم صاحب نے اپنے لئےصحافت کا راستہ اختیار کیا''۲۲؎

''شمیم احمد شمیم نے جن شخصیات کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ۔ پھر ان کی خوبیوں اور خامیوں کا بے خوف و خطر اظہار کر دیا۔خواجہ غلام محمد صادق کے خاکے میں انہوں نے خواجہ صاحب کی خوبیاں بھی بیان کیں ہیں اور ان کی خامیوں کو بھی منظر عام پر لا یا گیا ہے۔اس خاکے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''فائدہ یہ کہ انہیں اپنی سیاسی زندگی کے آغاز میں ہی وہ عزت وتوقیر اور منصب حاصل ہو گیا۔کہ جس کے لئے بخشی غلام محمد اور قبیل کے دوسرے رہنماں کو غیر معمولی جدوجہد کرنی پڑی۔تحریک آزادی کے سرکردہ رہنماؤں میں وہ غالباً سب سے کم مدّت کے لئے جیل گئے ہیں لیکن اس سب کے باوجود وہ اہم اور تاریخی منصبوں پر فائز رہے ہیں ان کی کم آمیزی اور سنجیدگی کی عادت نے انھیں جوانی میں ہی بزرگ بنا دیا لیکن اس سے نقصان یہ ہوا کہ صادق صاحب کبھی عوام سے براہ راست تعلق پیدا نہ کر سکے وہ عوامی زندگی کے آداب اس کے تقاضوں اور اس کے زیر بم سے ہمیشہ نہ آشنا رہے انہیں لوگوں کی عزت تو حاصل ہو گئی لیکن وہ ان کی محبت سے محروم رہ گئے۔عوامی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے عقیدت کی بلندیوں سے نیچے آ کر کبھی کبھی ذہن اور ضمیر کے ساتھ ناانصافیاں بھی کرنی پڑتیں ہیں۔صادق

صاحب نے ان بلندیوں سے نیچے آنے کی کبھی زحمت ہی گوارہ نہ کی۔
اس بے نیازی بلکہ سرد مہری کے لئے انہیں بہت بڑی قیمت ادا کرنی
پڑی ہے۔لیکن میرا خیال ہے کہ اتنی بڑی قیمت ادا کرنے کے باوجود
آج بھی اپنی روش بدلنے کو تیار نہیں''۔۲۳

اردو ادب کے سرمایہ میں پچھلے پچاس سالوں سے اردو خاکہ نگاری پر اور اس کے آغاز وارتقاء پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن افسوس کی بات ہ ہے کہ کسی ادیب یا نقاد نے شمیم احمد کی خاکہ نگاری کا ذکر نہیں کیا۔ میرے نزدیک اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے نقادوں اور ادیبوں نے ان کو نظر انداز کیا اور ان کی خاکہ نگاری پر توجہ نہ دی۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کی شمیم احمد کی تمام تحریریں ''آئینہ'' کی تہوں میں دبی پڑی تھیں جن کو ''آئینہ'' کے ساتھ ہی گم نامی اختیار کرنی پڑ رہی تھی لیکن آخر شمیم صاحب کی بہن قرأۃ العین نے ان تمام تحریوں کو دوبارہ شائع کرنے کا بیڑ اٹھایا اور آج شمیم احمد شمیم کی تحروں کے 13 جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں جن کو ''آئینہ نما'' نام سے شائع کیا ہے۔ ورنہ یہ بے بہا خزانہ بھی کسی سیلاب یا آتش کی نظر ہو جاتا۔ تو یقیناً اردو ادب، ان عمدہ اور نایاب تحریوں سے محروم رہ جاتا۔

****

شمیم کی کالم نگاری۔

شمیم احمد شمیمؔ کا شمار اردو صحافت کے معروف کالم نگاروں میں ہوتا ہے انھوں نے اپنے منفرد اور شگفتہ اسلوب کی بنا پر اپنے ہم عصروں میں نمایاں مقام حاصل کیا ان کی انفرادیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے ''آئینہ'' میں چراغ بیگ کے نام سے کم وبیش دو دہائیوں تک مسلسل کالم نویسی کی اس عرصے میں وہ ریاست کے مشہور اخبار ''آئینہ'' اور ساتھ ہی ساتھ سیاست سے بھی وابستہ رہے۔ شمیم احمد شمیمؔ کا قلم اگرچہ تحریر وتخلیق کے دیگر شعبہ جات، مثلاً تنقید اور خاکہ نگاری میں بھی رواں رہا، تاہم ان کی اول وآخر پہچان چراغ بیگ کی کالم نگاری ہی رہی اور اسی شعبے کوانھوں نے اوّلیت بھی دی۔ ان کی تحریر کی شگفتگی اور روانی نے قارئین کو نہ صرف ان کی طرف متوجہ کیے رکھا، بلکہ ایک صاحبِ اسلوب کالم نگار کی پہچان بھی دی۔

کالم نگار کی حیثیت سے شمیم احمد شمیمؔ کا یہ کارنامہ ہے انھوں نے عام آدمی میں سیاسی شعور بیدار کیا، سیاست دانوں کو ان کی غلطیوں پر ٹوکا۔ ''آئینہ'' کی زندگی میں شاید ہی کوئی سیاست دان اور حکمران ہوگا جسے شمیم احمد شمیمؔ نے اپنے طنز ومزاح کا ہدف نہ بنایا ہو اور یہ ثابت نہ کیا ہو کہ اتنی اونچی کرسیوں پر بیٹھنے والے کتنی نیچی سطح پر رہتے ہیں۔ وہ ان لکھنے والوں میں سے تھے جنھیں دیکھ کر بہت سارے لوگوں نے لکھنا سیکھا اور بہت سارے لوگوں نے چھوڑ بھی دیا۔ شمیم احمد شمیمؔ کالم نگاری سے ہماری صحافت کو تو بہت فائدہ پہنچا لیکن خود شمیم صاحب کی نِجی زندگی درست نہ رہی۔ اور ان کی بے باک کالم نگاری اور بے باک صحافت ان کے دیگر کمالات کا پردہ بن گئی۔ ایسا اکثر ہوا ہے کہ کسی ادیب کی ایک حیثیت اتنی نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس کی دوسری حیثیتوں کی طرف نظر نہیں جاتی۔ مولانا ظفر علی خان جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے نثر نگار تھے لیکن ان کی شاعری ذہنوں پر ایسی مسلّط ہوئی کہ ان کی نثر نگاری کو فراموش کر دیا گیا۔ پطرس کی مزاح نگاری کی ایسی دھوم ہوئی کہ کسی کو یاد نہ رہا کہ وہ اعلیٰ درجے کے نقاد بھی ہیں اور ان کی سنجیدہ تحریریں ان کی مزاحیہ تحریروں سے کئی گنا زیادہ ہیں اور نہایت فکر انگیز ہیں اسی طرح اگر شمیم احمد کا نام لیجیے تو ذہن میں ایک بے مثال کالم نگار چراغ بیگ کا تصور ابھرتا ہے حالانکہ ان کی تنقید، ادبی مضامین اور خاکے بھی بے مثال ہیں۔

''آئینہ'' کا تعارف اور اس کی تحقیق میں چراغ بیگ والے کالم کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ دراصل

چراغ بیگ ایک نہایت ہی دلچسب کردار ہے جو ایک خوش مزاج شخصیت کا حامل ہے جس کا تصوّر نہایت ہی بلند لیکن ایک خوش مزاج خیال سے پرُ ہے۔ انسانی زندگی کے ہر ہر پڑاؤ اس کے لئے دلچسپ ہیں۔ ذوق وشوق بھی عجیب ہے۔ چراغ بیگ اپنی ہی کہانیوں پر مسکراتا ہے اور پھر اپنی غلطیوں سے چھٹکارہ پانے کے لئے ایک ترغیب بھی دیتا ہے۔ چراغ بیگ کا کردار تنقیدی و تحقیقی شعور سے بھی باقاعدہ واقف ہے۔ اسی لئے تو چراغ بیگ کے مضمون منہ میں شہد کی سی مٹھاس پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی تحریروں کو پڑھ کر چراغ بیگ کی محبت دل میں سرائیت کر جاتی ہے۔

چراغ بیگ کی سب سے بڑی قابلیت یہ ہے کہ وہ انسان کو دل کھول کر ہنساتہ بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے مضمون کے ذریعہ جو پیغام قارئین تک پہنچانا چاہتا ہے یعنی کہ اس کے احساس کو بھی جگا دیتا ہے۔ چراغ بیگ اپنی معمولی سی بات کو بھی نہایت ہی دلچپسی اور حسّاسیت کا سامان بنا دیتا تھا۔ چراغ بیگ کی ایک مرتبہ ایک تانگے والے سے گرما گرم تو، تو میں، میں ہو گئی۔ تانگے والے نے خلاف قانون تانگے پر زیادہ سواریاں بٹھا دیں اس پر چراغ بیگ نے احتجاج کیا، وہیں تانگے والے نے بھی گھوررنا شروع کیا اور آواز بلند کر دی اس پر تانگے والے نے کہا۔ ’’تانگہ میرا ہے آپ کون ہوتے ہیں مجھے منع کرنے والے لیکن اس کا جواب چراغ بیگ نے نہایت ہی چونکا دینے والا دیا ’’تانگہ آپ کا ہے لیکن یہ ملک میرا ہے اس کا فیصلہ میں کروں گا۔‘‘

اس سے چراغ بیگ کی ذہنی قابلیت اور حساسیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چراغ بیگ کی تحریریں تو روز مرّہ کی عام فہم و سادہ زبان میں ہوتی تھی لیکن اس سب کے باوجود اس میں ادبیت جھلکتی تھی اور ان کی ادبی صلاحیتوں کا اظہار بھی چراغ بیگ کے کردار میں ہوا ہے۔ یہ ’’آئینہ‘‘ کا ایک ایسا کردار تھا۔ جو ادب کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حریفوں کا کہنا یہ تھا کہ اس کے سامنے کوئی بھی ایسی ویسی بات آ جائے تو یہ پگڑی اچھال دیتا ہے۔ اور وہ خود بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ لوگ اس کے بارے میں یہی سوچتے ہونگے کہ اس کو بڑی شخصیتوں کے کمزور پہلو ابھارنے میں ایک مریضانہ لذّت کا احساس ہوتا ہے لیکن لوگوں کو یہ محسوس ہوتا رہے میں ہمیشہ انصاف سے حقائق کو منظر عام پر لاؤں گا اور وہی چراغ بیگ نے کیا کیوں کہ چراغ بیگ نے جس سماج میں آنکھ کھولی اس سماج میں درندے بشکل سیاسی رہنما سماج پر حاوی تھے۔ جن کی اصلی صورت چراغ بیگ نے نہایت ہی دلچسپ انداز میں بیان

کی۔

ریاست جموں وکشمیر میں جتنی بھی مایہ ناز ہستیاں گزری ہیں ان میں شمیم احمد شمیمؔ بھی صفِ اوّل میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ادب ، ملازمت، صحافت، سیاست وغیرہ کئی میدانوں میں اپنا جھنڈا گاڑھا۔ اگر چہ سیاست سے ان کی ادبیّت اور صحافت کو نقصان بھی پہنچا ہے۔ اور جو لوگ ان کو سیاسی حد تک جانتے پہچانتے ہیں وہ لوگ ان کی ادبی صلاحیتوں کو نہیں جانتے ہیں۔ اسی وجہ سے 1981ء کے ''آئینہ'' کے یادگاری شمارہ میں جن لوگوں نے ان کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کئے ہیں وہ مرحوم کی زندگی کے ان پہلوں کو نظر انداز ہی کر گئے اور ان کی ادبی کاوشوں کو کچھ خاص اہمیت نہیں دی۔ شمیم کی اس مصروف زندگی کے بارے میں پڑھ کر ان کے ذوق ادب اور وسیع مطالعہ پر حیرانی ہوتی ہے۔

وہ انگریزی، اردو، اور کشمیری ادب کے ذہین قاری تھے جو چیز ایک بار پڑھ لیتے اس کے بارے میں تحریری اور زبان اپنے تاثرات کا اظہار بھی کرتے تھے۔ شمیم احمد شمیمؔ نے طالب علمی دور سے ہی لکھنے کی ابتدا کی نظم و نثر دونوں میں طبع آزمائی کرنا چاہی لیکن ان کے استاد پروفیسر شوریدہ کاشمیریؔ کے بقول انہوں نے محمد یوسف ٹینگؔ اور شمیم دونوں کو نثر لکھنے کا مشورہ دیا۔ کالج میں زیر تعلیم ہونے کے دوران ان کی اردو میں لکھنے کی صلاحیت سے اس وقت پردے اٹھنے لگا جب وہ ''پرتاپ میگزین'' کے اردو سیکشن کے اڈیٹر ہوئے۔ شمیم شعر بھی کہنا چاہتے تھے لیکن ان کی طبیعت کو نثر راس آئی۔ انہوں نے نثر لکھنے میں فکشن میں شروعات کرنے کے بجائے تنقیدی جائزوں تبصروں اور دوسری تحریروں پر رائے زنی کرنے سے اس کا آغاز کیا۔ ظاہر ہوتا ہے کہ تنقید ہی سے ان کی طبیعت کو مناسبت تھی۔ جو آگے چل کر تصدیق ہوگئی۔

شمیم احمد شمیمؔ تقریر و تحریر دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔ ان کی تقریروں میں ادبیّت کم اور صحافیانہ حصّہ زیادہ ہوتا تھا۔ شمیم احمد شمیمؔ نے سیاست، صحافت کے ساتھ ساتھ تنقید کا کام بھی انجام دیا اگر چہ اس کا سرمایہ کم ہی ہے۔ انہوں نے گنے چنے تنقیدی مضامین لکھے ہیں جو یہ ضرور ثابت کرتے ہیں کہ ان کی ناقدانہ صلاحیت بھی نہایت ہی عمدہ تھی۔

جس کی زندہ مثال مضمون ''ہم سخن فہم ہیں'' میں ملتی ہے۔ یہ مضمون سن 1952ء ایس پی کالج سرینگر کے

ترجمان رسالہ ''پرتاپ'' میں شائع ہوا۔میگزین کے نگران پروفیسر محمد طیّب صدیقی نے اس کے آغاز میں لکھا ہے کہ یہ'' کلام غالبؔ اور جناب غالبؔ پر ایک تنقیدی حملہ ہے۔ جو جارحانہ ہونے کے ساتھ ساتھ وحشیانہ بھی ہے۔'' جس کا اعتراف شمیم احمد شمیمؔ صاحب نے آئینہ کے تیسر شمارے سن 1964ء میں بھی کیا ہے اور شمیم احمد جیسے باغی نوجوان نے مرزا غالبؔ کے شاعرانہ کردار پر لکھنے کی جسارت کی اور خوب خبر بھی لی۔ شمیم احمد شمیمؔ نے جوان پر وار پر وار کیا ہے اس میں مرزا غالبؔ کی شکل وصورت ان کی زندگی ان کے اعدات واطوار ان کی شاعری سب کچھ ان کی زد میں آ گیا تھا خود لکھتے ہیں۔

''غالبؔ پرستوں نے جذبہ عقیدت سے اثر پزیر ہو کر غالبؔ کو ایک آئیڈیل شخص بنا دیا ہے۔اس کی شکل وصورت عادات وفضائل اور کردار پر کچھ اس طرح سے حاشیہ آرائی کی گئی ہے کہ غالب کی سوانح حیات سے واقفیت نہ رکھنے والے قاری کو وہ ایک فرشتہ سیرت، وجیہہ صورت، مکمل اور جامع شخصیت نظر آتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مرزا کی جو عام تصاویر ملتی ہیں انہیں دیکھ کر انہیں خوبصورت کہنا جمالیاتی ذوق کی توہین اور پرے درجے کی بد مذاقی ہے جہاں تک ان کی سیرت کا تعلق ہے میری رائے میں ان کی سیرت میں کوئی ایسی غیر معمولی خصوصیت نہیں ہے جو انہیں عام انسانوں سے ممتاز کر سکتی ہو''۔۲۴

آگے مزید لکھتے ہیں کہ

''جس طرح حافظ شیرازی کے مدّاح ان کی شراب نوشی کو بادۂ معرفت اور ان کی عشق بازی کو عشق حقیقی سے تعبیر کر کے ان کی شاعرانہ عظمت اور برتری کے دعویدار ہیں ٹھیک اسی طرح غالب پرست بھی کلام غالب کی دوراز کار تاویلات اور توضیحات کر کے ان کے مہمل اور معمولی اشعار کو بھی غیر معمولی اہمیت دے رہے ہیں''۔۲۵

شمیم احمد اس بات سے اتفاق ضرور کرتے ہیں کہ غالب کے یہاں معنی آفرینی، نازک خیال ،لفظی صناعی، شوخی تحریر ضرور ہے لیکن انکے کلام کو شمیم محض واردات عشق کے بیان تک محدود رکھتے ہیں۔اور شمیم غالب سے اس بات سے بھی نا اتفاقی کرتے ہیں کہ غالب ''زندگی کا کوئی واضح شعور بھی نہ رکھتے تھے''۔انہیں غالب کے کلام میں کوئی خاص مقصدیت بھی نظر نہیں آتی ہے۔

انہوں نے ثبوت کے طور پر غالب کے ابتدائی اشعار کا حوالہ بھی دیا ہے۔اگر چہ غالب اردو زبان بلکہ دوسری زبان کے لوگوں کے بھی مقبول شاعر ہیں یہ ان کی اپنی تحقیق اور اپنی رائے تھی۔جس سے ہم سب کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ہاں یہ بات ضرور ہے کہ شمیم کا یہ مضمون غالب صاحب کو کٹگھرے میں ضرور کھڑا کرتا ہے۔شمیم احمد ذاتی تعلقات، یاری دوستی اور دوسرے تمام تعلقات سے اوپر اٹھ کر تنقید کے فرائض کو اہمیت دیتے ہیں اور ان کی مختصر تنقید نے بھی اعلیٰ مقام پایا ہے۔

''آئینہ'' کا مشہور و مقبول کالم تیسرا صفحہ چراغ بیگ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس صفحے سے شمیم کی کالم نگاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اس سے شمیم احمد کی ذہانت ،طنز مزاح ،شوخی تحریر ،ظرافت کی بھر پور عکاسی ہوتی ہے اور ان تمام چیزوں کی شمولیت سے ان کی کالم نگاری مقبولیت کی بلندی تک ہونچتی ہے۔چراغ بیگ کا نام اس دور میں عوام کی زبان کا ذکر بن گیا تھا۔چراغ بیگ کا یہ کالم ''آئینہ'' کے قارئین کی توجہ کا مرکز تھا۔اپنے کالم میں ''جھوٹ اور سفید جھوٹ'' کے نام سے لکھتے ہیں کہ۔

> ''صبح سے شام تک لوگ اتنا جھوٹ بولتے رہتے ہیں کہ چراغ بیگ نے جھوٹ کو ایک صداقت کے طور پر تسلیم کر لیا ہے اور اب اگر کوئی اس سے جھوٹ نہ بولے تو اسے حیرت ہوتی ہے لیکن یہ بات صرف جھوٹ کے بارے میں صحیح ہے سفید جھوٹ اسے اب بھی چونکا دیتا ہے اور کبھی کبھی وہ اس کو جھٹلانے اور جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچانے کا عزم بھی کر لیتا ہے۔آج ایسے ہی سفید جھوٹ کی قلعی کھول کر سفید جھوٹ بولنے والوں کو ''آئینہ'' دکھانے کے لئے قلم اٹھایا ہے۔کہ دیکھ لو

اپنی تصویر کہ کتنے باشرم اور بے حیا اور بے غیرت دکھائی دیتے ہو۔
ریاستی حکومت آئے دن چھوٹے موٹے جھوٹ بولتی ہتی ہےاور ریاستی
عوام نے اس حقیقت کو ناگریز سمجھ کر گوارا کر لیا ہے کہ یہ حکومت جھوٹ
بولنے سے باز نہیں آسکتی اور اس لئے انہوں نے صداقت پرکھنے کا
ایک نیا معیار قائم کیا ہے جس کی رو سے ہر وہ بات صحیح ہے جس کی تردید
حکومت کرے۔اور ہر وہ بات غلط جس کی تصدیق ریاستی حکومت
کرے اس ریاست میں سچ اور جھوٹ کے پرکھنے کا اس سے موثر ،مفید
اور قابل عمل نسخہ موجود نہیں اور چراغ بیگ اہل کشمیر کو اس نسخے کی
دریافت پر مبارک باد دیتا ہے۔'' ۲۶

دراصل چراغ بیگ کا یہ کالم عوام کے ہر طبقے کا ترجمان تھا اس کی بنیادی خصوصیت یہ تھی اور مقبولیت کی وجہ بھی کہ اس میں ریاست اور بیرونِ ریاست بلکہ بین الاقوامی سطح پر سیاست کے اہم ترین موضوعات سے لیکر میونسپلٹی کی کارگردگی ،ٹرانس پورٹ کی عدم دستیابی اور بازار کی عام واردات کے ہونے کا بڑے دلچسپ انداز میں تبصرہ ہوتا۔عوام وخواص سیاست دان اور امراء سب چراغ بیگ کی ذد میں آجاتے تھے۔ ملاحظہ ہو چراغ بیگ کا ایک عام آدمی پر کالم:۔

''علاقہ شوپیان کے موضع ۔۔۔۔میں چراغ بیگ کے ایک جان
پہچان والے بزرگ رہتے ہیں۔ علاقہ بھر میں مشہور آدمی ہیں۔
جنگلات سے لکڑی چرانا ان کا مشغلہ ہی نہیں، ذریعہ روزگار بھی ہے۔
کبھی کبھی گھوڑے چرا کر بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔
گاؤں کے ہر مقدمے اور تنازعے میں فریق ہوتے ہیں۔مقدمات
میں جھوٹی گواہی دینے میں ان کا جواب نہیں پولیس کے افسروں کو جی
بھر کر رشوت دیتے ہیں اور اسی بناء پر ابھی تک حوالات کی سیر نہیں کی

ہے۔آدمی بڑے تیز طرار اور دلچسپ ہیں اور ''بڑے'' آدمیوں سے راہ ورسم پیدا کرنے کا انہیں بڑا شوق ہے۔اسی لئے تحصیل دار سے لے کر ڈپٹی کمشنر تک سبھی لوگ انہیں جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں۔

یہ حضرت پچھلے ایک ماہ سے میرے پیچھے پڑ گئے ہیں کہ میں ان کے حجِ بیت اللہ جانے کا انتظام کروں باالفاظِ دیگر ان کے لئے حج پر جانے کے لئے سیٹ کا بندوبست کروں۔پچھلے ہفتے انہوں نے یہ انکشاف بھی فرمایا کہ وہ سیٹ حاصل کرنے کے لئے ہزار ڈیڑھ ہزار روپے کی رشوت بھی دینے کے لئے تیّار ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ صاحب جوں توں کر کے اپنے لئے سیٹ حاصل کر کے ہی دم لیں گے اور بیت اللہ شریف کی زیارت کا شرف حاصل کریں گے۔واپسی پر یہ حضرت بہت سی ممنوعہ چیزیں بھی ''سمگل'' کریں گے۔اور پھر حاجی صاحب کہلائیں گے۔کیا مفتیان اکرام اور علماء دین یہ بتانے کی زحمت کریں گے کہ ان حضرات سے اور اسی قماش کے دوسرے عازمینِ حج کا حج جائز ہے۔؟۔میرا خیال ہے کہ اس قسم کا حاجی صاحبان اسلام اور مسلمان دونوں کے لیے تزلیل کا باعث ہیں۔اور انہیں حاجی کے بجائے پاجی کہنا چاہیئے۔[۲۷]

یہی وجہ تھی کہ ان کے کالم عوام میں بہت مقبول ہوا کرتے تھے۔کیوں کہ ان کی یہاں سچائی اور زمینی حقائق کو ترجیح حاصل تھی عوامی سطح پر کالم کی مقبولیت کا عالم یہ تھا مدّاح تو مدّاح ان کے سیاسی وسماجی افکار سے شدید اختلاف رکھنے والے حتیٰ کہ ان کے بدترین دشمن بھی بڑی بے چینی سے آئینہ کا انتظار کرتے اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے۔کہ دیکھیں آج چراغ بیگ کس کو'' آئینہ'' دکھا کر بے نقاب کرتا ہے۔لیکن سیاست دان اور حکمران طبقہ چراغ بیگ کی بے باقی بے خوفی اور نتائج سے قطعی بے پرواہ ہو کر بے رحم تنقید کے خلاف اور خوف زدہ تھے۔اور بقول چراغ بیگ۔

’’ان کا بس چلتا تو وہ ’آئینہ‘ کی اشاعت پر پابندی لگا کر ہی دم لیتے‘‘

شمیم احمد کی کالم نگاری کو جس چیز نے معنویت اور ابدیت بخشی ہے وہ ان کا دانشورانہ اور مفکرانہ طرز عمل ہے۔ ان کے یہاں چھوٹے سے چھوٹے موضوع کو چھیڑا گیا ہے اور بڑے سے بڑے موضوع پر بھی لکھا گیا ہے۔ جب ہم آئینہ کے کالم والے حصے پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں مختلف قسم کے موضوعات ملتے ہیں چھوٹے سے چھوٹے بھی اور بڑے سے بڑے بھی۔ ان میں زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے، ناک کا سوال، قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا، آنا زینہ کدل سے ٹانگے پر، موئے مقدس۔ کتنی بلندی کتنی پستی۔ طالب علموں کی وکالت، جھوٹ اور سفید جھوٹ، آواز دو قانون کو قانون کہاں ہے، بے پر کیہ، آئے دن کی ہڑتالیں، ہونا کانگرس میں شامل اور بننا منسٹر، دی بائبل اور معترضین، کارِ مکاں دراز ہے، ہدایت نامہ ممبرانِ اسمبلی، چھوٹا منہ بڑی بات، مقابلہ حسن کیوں، صادق صاحب کا چڑیا گھر، سفارش نہیں سفارشات، اخبارات کی فیملی پلاننگ، ہم مؤ جد ہیں مقلد نہیں، واہگہ کی سرحد، پیشاب کرنے کے آداب، سرکاری غنڈہ گردی، حقیقت خرافات میں کھو گئے۔ مجھے نفرت ہے، چھ سال در مدح چرس، اعلان جنگ، فریبِ آزادی، لیلیٰ کا خط مجنوں کے نام، یہ بیگار بند کیجئے دیکھو جو مجھے دیدہ عبرت نگاہ ہو، باضمیر مگر بے وقوف، چمبل کی گھاٹی اور کشمیر کی وادی، نیند کیوں رات بھر نہیں آتی، سخن ہائے گفتنی، روزگار نہیں ریزگار، پہاڑ پارک سے پرتاپ پارک، ہاتھ سے ناک تک، نوجوان سیاست دانوں کے نام شہری اور دھاتی فتنہ، والدہ مرحومہ کی یاد، ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے۔ جیسے بے انتہا مضمون ’’آئینہ‘‘ کے کالم کی زینت بنے جن مضامین نے سماج کے ہر طبقے کی نمائندگی کی ہے۔

اس کے علاوہ انہوں نے اپنے کالم میں دونوں ملکوں ہندو پاک کی مذہب کے نام پر تقسیم کاری اور باہمی تعلقات کے بارے میں بھی اپنے کالم میں لکھا ایک کالم میں لکھتے ہیں:۔

’’چراغ بیگ واہگہ پہنچا تو بارڈر سیکیورٹی فورس کے ایک
خوش اخلاق آفیسر نے اس کا استقبال کیا۔ دور کچھ فاصلے پر سڑک کے

عین وسط میں دو بڑے بڑے پھاٹک نظر آئے جن پر ہندوستان اور پاکستان کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔معلوم ہوا کہ یہ ہندوستان اور پاکستان کی سرحدی ''چیک پوسٹ'' ہیں جو صبح سات بجے سے لے کر شام سات بج کر دس منٹ تک رہتے ہیں۔سات بج کر دس منٹ پر تقریب منعقد ہوتی ہےاور میں دراصل یہی تقریب دیکھنے آیا تھا۔ابھی سات بجنے میں کچھ دیر باقی تھی اس لئے میں بی ایس یف کے خوش اخلاق آفیسر کے ساتھ ''بین الاقوامی'' سرحد پر ٹہلنے کے لئے نکل گیا۔
کچھ ہی دور جا کر مجھے اندازہ ہوا کہ ایک ملک کو مذہب اور سیاست کی بنیادوں پر تقسیم کرنے کا ''سنجیدہ'' کام کس درجہ مضحکہ خیز اور بے ہودہ نتائج کا حامل ہوسکتا ہے۔ ٹہلتے ٹہلتے کبھی میرے قدم پاکستان کی سر زمیں پر پڑ جاتے اور میں یہ سوچنے لگتا کہ ہندوستان اور پاکستان ایک دوسرے کے کتنے قریب ہیں۔کئی جگہ پاکستان کی زمیں میں اگنے والے پودے کچھ اس طرح ہندوستان کی سرزمیں کی طرف جھکے نظر آتے کہ ان کو جدا کرنے والی سرحد کا وجود ہی نظر نہیں آتا۔دونوں طرف کے کسان اپنے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اس طرح خوشی میں نظر آرہے تھے کہ جیسے انہوں نے ملک کی تقسیم ہونے کی خبر ہی نہ سنی ہو۔دونوں طرف کی پگڈنڈیاں ایک دوسرے میں کچھ اس طرح الجھی ہوئی نظر آتیں ہیں کہ بی ایس ایف کا آفیسر میرے ساتھ نہ ہوتا تو میں دو ڈھائی میل کے اس سفر میں کئی بار سرحد پار کرنے کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو چکا ہوتا۔سرحد کے دونوں طرف کہیں کہیں پاکستانی رینجر اور ہندوستان کے سپاہی گشت کرتے ہوئے نظر آئے مجھے معلوم ہوا کہ

ہندوستانی اور پاکستانی سرحدی پولیس کے آفسروں کے تعلقات انتہائی
دوستانہ اور خوشگوار ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چائے پیتے
ہیں۔کبھی کبھی ایکدوسرے کو کھانا بھی کھلاتے ہیں اس طرح ایک
دوسرے کے کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتے ہیں۔'' ۲۸

شمیم احمد شمیمؔ کے ان کالموں کو پڑھ کر یہ اندازہ بہ خوبی ہوجاتا ہے کہ جہاں ان کی تحریر میں ظرافت، شوخی فکر پسماندگی اور طنز مزاح کے عنصر کے ساتھ ایک درد تڑپ اور چبھن شامل ہوتی ہے وہ اگر سیاست دانوں کی ریا کاری خودغرضی اور نا اہلی پر ناراض نظر آتے ہیں تو عوام کی بے حسی، بے نیازی، بزدلی اور ہر حال میں صبر اور شکر کرنے کی عادت انہیں برہم کرتی ہے۔ وہ اپنے مضامین میں ''مقابلہ حسن'' اور'' دی بائبل'' کی نمائش پر اعتراض کرنے والوں کے سخت خلاف ہیں اور ان کی ذہنی اور فکری پسماندگی پر ماتم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ان اعتراض کرنے والوں کے اس کام کو نیک عمل بالکل نہیں سمجھتے۔ چاند تک جانے والوں کو وہ دنیا کی ایک عظیم کامیابی سمجھتے ہیں اور وہیں اپنی قوم کو کوستے ہیں کہ امریکہ اور یورپ چاند تک پہنچ گئی لیکن ہم مسلمان لوگ حلال اور حرام جائز اور ناجائز کے زمرے میں پھنسے ہوئے صدیاں گزر گیں وہ زمینی سطح پر ہو رہی نا انصافیوں، نا برابریوں غربت و پسماندگی کے اندھیروں کو بھولتے نہیں لیکن اس سماج کو بھی وہ اپنی پسماندگی کے جرم میں برابر کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

آج سے پچاس سال پہلے کی سیاست اور سماج اور آج کی سیاست اور سماج میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن جب ہم شمیم احمد شمیمؔ کی چراغ بیک والے کالم کو پڑھتے ہیں تو دور جدید کا سارا کا سار نقشہ ہماری نظروں میں گھومنے لگتا ہے گویا کہ آج کل کے کسی نڈر اور عمدہ صحافی کی تحریر پڑھ رہے ہوں جو کہ موجودہ دور کی حکومت اور اس کی پالیسی اور مذہب اور ذات پات کے نام پر ایک دوسرے کو لڑانا سب عیاں ہوجاتا ہے اور یہی ان کی سب سے بڑی کامیابی بھی ہے کہ پچاس سال بعد ان کی تحریریں تازہ دم لگتی ہیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ آج شمیم جیسا کوئی کالم نگار اور صحافی نہیں ہے جو نڈر ہو کر لکھتا جس کو اپنے اقتدار اور عہدہ کے کھونے کا ڈر نہ ہوتا لیکن شائد کوئی ڈھونڈنے سے بھی نہ مل پائے۔ یہی وجہ ہے کہ شمیم احمد شمیمؔ کے استاد پروفیسر آل احمد سرور ان کی تحریر سے بے حد خوش

ہوتے اور خود سرور صاحب شمیم احمد شمیم کو دیوان سنگھ مفتون کا ہم پلہ صحافی قرار دیتے ہیں۔اور ان کے ہم عصروں کی بھی یہی رائے ہے کہ شمیم اگر سیاست میں نہ آتے تو برّصغیر کی ادیب بنتے۔

''آئینہ'' کے تیسرے صفحے کے کالم میں اہم اور مرکزی کردار چراغ بیگ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔جو اپنی بے باک اور طنزیہ طرز تحریر کی بدولت عوامی سطح پر ایک مقبول ترین کردار تھا۔وقت کے حاکموں کے لئے وہ ایک سر درد سے کم نہ تھا۔اس کے قلم کی سچائی، قلم کی کاٹ اور چبھن سے بے حد پریشان اور خائف تھے۔اگر ان کا بس چلتا تو چراغ بیگ کا خاتمہ کر کے ہی دم لیتے لیکن چراغ بیگ کے قلم کو خاموش کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔لمبے عرصے تک چراغ بیگ نے اپنا کام انجام دیا اور عوام میں چھائے رہے۔یہ ان کی ایمان داری اور بے انتہا محنت کا نتیجہ تھا اسی دوران انہوں نے چراغ بیگ کے علاوہ بھی کچھ کرداروں کو جنم دیا ان میں ش احمد، کوہن اور زارداں بی اے۔بھی کے نام سے بھی کالم لکھے لیکن زیادہ تر کالم انہوں نے چراغ بیگ کے نام سے ہی لکھے اور ان کو چراغ بیگ کے نام سے ہی اکثر لوگ جانتے تھے۔شمیم احمد شمیم کا کالم ''بادشاہ خان کے ساتھ چند لمحے'' ایک اہم اور تاریخی ملاقات ہے۔بادشاہ خان کا شمار برصغیر کی اہم اور نامور شخصیات میں ہوتا ہے۔

شمیم صاحب نے اپنی مختصر سی ملاقات میں ان کے سامنے ہندوستانی جمہوریت میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی اور مسلمانوں کے دردناک مستقبل پر اپنے شدید ردّعمل، غصے اور مایوسی کا اظہار کیا ہے ان ہی دنوں ملک میں ہوئے فسادات کے بارے میں انہوں نے اقتدار پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو باخبر کرتے ہوئے اس بات سے آگاہ کیا کہ مجرموں کا ساتھ دینے سے ملک انتشار اور تشدّر کا شکار ہو جائے گا۔شمیم نے فسادات سے متاثر لوگوں کے لئے قائم کئے گئے کیمپوں کا دورہ کر کے مسلمانوں کی کسمپرسی اور زبوں حالی دیکھ کر حکمرانوں کی مجرمانہ غفلت پر ان کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ اسی قوم کی بے بسی ور پسماندگی کا درد شمیم کے سینے میں موجود تھا وہ اپنی قوم کو ترقی کی راہ پہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی قوم کی بے رخی اور بدحالی پر اپنے کالم میں یوں رقم طراز ہیں۔

> عوام کے نام۔ پیارے عوام، تمہاری سخت جانی پر مکمل اعتماد رکھتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ تم باوجود آلام روزگار، چرخ کج رفتار اور ''عنایات'' پروردگار کے بخیر و عافیت ہونگے تمہاری خیریت اور

عافیت سے بڑے بڑے لوگوں کی توقعات وابستہ ہیں اسی لئے خدا کرے تمہاری ہڈی پسلی اور سادہ لوحی سلامت رہے کئی دنوں سے تمہیں خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن ''خواص پسند'' طبیعت کو تم سے مخاطب ہونا گوارہ نہ تھا۔ بڑی مشکل سے اسے آج اس گناہِ بے لذّت پر آمادہ کیا ہے۔ امّید ہی نہیں بلکہ یقین واثق ہے کہ میرا یہ خط پڑھنے کے باوجود تمہاری حالت، لاعلمی، تعصب وحماقت اور شرافت میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا اور تم حسبِ دستور پٹتے رہوگے اور اُف بھی نہ کروگے خدا تمہیں اپنی حماقت کا بوجھ اٹھانے اور اپنے رہنماؤں کی قسمت سنوارنے کی مزید توفیق عطا کرے۔ بھولے بھالے عوام! تمہیں معلوم ہے تمہارے مدقوق چہروں پر صدیوں سے جو گرد جمع ہوئی ہے یہ کہاں سے آتی ہے؟

تمہیں کبھی اس بات کا احساس ہوا ہے کہ تمہاری بے نور آنکھوں کی بینائی کہاں گئی ہے۔؟ تمہیں کبھی یہ سوچنے کی فرصت ملی ہے کہ تمہاری پیٹھ پر زخموں کے جو نشان ہیں یہ کس کی دین ہے۔ تم نے کبھی اپنے ضمیر سے یہ پوچھنے کی زحمت گوارہ کی ہے کہ تم کیا ہو؟ تمہارے وجود کی اصلیّت اور تمہاری زندگی کی حیثیت کیا ہے تم نے کبھی اپنے رہبروں اور اپنے رہنماؤں سے یہ سوال کیا ہے کہ تمہاری منزل کیا ہے تم کہ جو وفاداری قربانی اور عقیدت کے نام پر موت کو بھی گلے لگاتے ہو کبھی یہ سوچتے ہو کہ ان الفاظ کے معنی کیا ہیں اور تم سے وفاداریوں کا مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے۔؟ اگر تم کو ایک بار بھی یہ سوالات پوچھنے کی ہمت پیدا ہو جائے تو یقین کرلو کہ تم عوام کی پست سطح سے اٹھ کر خواص کی بلندیوں کو چھونے لگوگے۔ اور پھر دنیا میں عوا وخواص کا فرق مٹ

جائے گا۔لیکن یہ تمہاری بدقسمتی اور تمہارے رہبروں کی خوش قسمتی ہے
کہ تم نے صدیوں سے اس قسم کا کوئی سوال نہیں پوچھا ہے اور مجھے یقین
ہے کہ تم آئیندہ بھی نہیں پوچھو گے۔حالانکہ تمہارے ایک سوال سے
تاریخ کا دھارا بدل سکتا ہے۔تمہاری خاموشی تمہارے ایثار اور تمہارے
صبر سے لٹیروں کی عزت عظمت اور سیرت وابستہ ہے۔'' ۲۹

اس طرح شمیم نے ''آئینہ'' کے تیسرے صفحے کی کالم نگاری کو نہایت ہی دلچسپ انداز میں بیان کیا۔قوم کی محبت اور درد ان کے سینے میں موجود تھا۔ایک آگ تھی جو ان کو بیٹھنے نہیں دیتی تھی وہ اپنی قوم کو کامیابیوں کی بلندیوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔اس کے باوجود وہ جب اپنی قوم کی بے رخی اور ضمیر فروشی کو دیکھتے تو ان کا دل بہت جلتا تو پھر ''اپنی قوم کے نام'' جیسے کالم لکھنے پر مجبور ہوتے۔اس کالم میں طنز کے ساتھ ساتھ یہ سبق بھی سکھایا ہے، کہ آخر کب تک تم ان سیاسی رہنماؤں کے تلوے چاٹتے رہو گے کیا تم نے کبھی اپنے حقوق کی خاطر ان سے سوال کیا ہے؟ اور خود ہی بتاتے ہیں کہ اور اگر کیا ہے تم ایک عام آدمی نہیں بلکہ تم خواص میں شامل ہو اور یہی ہماری قوم کا المیہ ہے کہ سیاست دانوں نے ہمیشہ سے اس قوم کا استحصال کیا ہے اور انہوں نے کبھی ان سے اپنے حق کے بارے میں پوچھا تک نہیں کیوں کہ ہم میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ ہم اپنے حکمرانوں سے سوال کر سکیں اپنی قوم سے لے کر اپنے افسروں، کاروباریوں، سیاست دانوں امراء، غریبوں، تانگے والوں، ہر ایک کو اپنے کالم میں جگہ دے کر ان پر خوب لکھا۔اور اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کی بے انتہا کوشش کی۔

شمیم احمد شمیمؔ کی کالم نگاری میں مزاح نگاری کمال درجے کی تھی۔وہ اپنے مختصر سے کالم میں مزاحیہ انداز میں اپنے قاری کو وہ بات سمجھا دیتے ہیں، جو بڑی بڑی کتابیں پڑھنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ان کے مزاح میں ایک عجیب قسم کی مٹھاس تھی۔جو ایک بار کسی کو لگ جاتی وہ ہمیشہ اس مٹھاس کا مشتاق رہتا۔

شمیم احمد شمیمؔ نے تہذیبی و تمدنی معاملات کی مضحکہ خیزیوں کو بھی اپنے کالم نگاری میں اجاگر کیا ہے اور ان نازک حقیقتوں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے جن کا براہ راست تعلق روزمرہ کی عمومی زندگی کے واقعات وحادثات سے ہوتا ہے ملاحظہ ہو شمیم احمد کے طنز و مزاح کا ایک اقتباس۔

''کون کہتا ہے کہ ''کشمیر شاہراہِ ترقی'' پر گامزن نہیں ہے؟ پلوامہ تحصیل ایجوکیشن آفس پر مسلح ڈکیٹی سے لے کر امتحانی مراکز پر نقل نویسی کے منظّم تجربات ''اس شاندار ترقی'' کے عظیم الشان نمونے ہیں وہ دن گئے جب بُز دل کشمیری پڑوسیوں کی مرغیاں چرا کر اپنے گناہ کی تسکین کیا کرتے تھے۔ اب وہ جنگلات سے لاکھوں روپے کی لکڑی، سرکاری سٹوروں سے ہزاروں من سیمنٹ قومی خزانون سے کروڑوں روپے، کاغذاتِ نامزدگی میں سے حلف نامے اور بلٹ بکسوں میں
سے سینکڑوں ووٹ چرا کر بھی مطمئن نہیں۔ اوراسی لئے اب اس وادیِ گل پوش میں مسلح ڈاکہ زنی کے تجربات بھی شروع ہو گئے ہیں۔ پلوامہ تحصیل ایجوکیشن آفس پر ڈاکہ ڈال کر ستر ہزار روپے کی حقیر رقم اُڑا لے جانا اس نئے تجربے کی ایک حقیر سی ابتداء ہے اور چراغ بیگ کو امید ہے کہ برادرانِ وطن اس میدان مین بھی اپنا نام روشن کریں گے بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے نو جوان آجکل امتحانی مراکز پر ''نقل نویسی'' میں دادِ شجاعت دے رہے ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب چراغ بیگ جیسے نا لائق اور نا قابل طالب علم امتحانی مراکز میں یوں داخل ہوتے تھے۔ جیسے کسی مندر یا مسجد میں قدم رکھ رہے ہوں۔ کسی لڑکے کو نقل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا جاتا تو یوں محسوس ہوتا کہ وہ مسجد سے جوتے چرانے کے الزام میں پکڑا گیا ہو۔

اول تو کسی طالبِ علم کو نقل کرنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی اور جب کوئی مادر پدر آزاد قسم کا لڑکا اس جرم کا ارتقاب کرتے ہوئے پکڑا جاتا تو امتحانی حال میں بیٹھے ہوئے تمام طالب علموں کے پسینے چھوٹ جاتے اور مجرم طالبِ علم اتنا زلیل وخوار ہو جاتا کہ کسی کی طرف

آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکتا اور کل ملا کر ایسے طالب علموں کی تعداد ایک فیصدی سے زیادہ نہ تھی جو امتحانی مراکز میں نقل نویسی کرنے کی کوشش میں پکڑے جاتے۔ چراغ بیگ نے سنا ہے کہ امریکہ میں امتحانات کا طریقہ یہ ہے کہ طالب علموں کو امتحان حال میں کتابیں لے جانے کی اجازت ہے۔ اور وہ کتابوں سے مدد لے کر سوالات حل کر سکتے ہیں۔ امریکہ میں ایسا ہوتا ہے یا نہیں لیکن کشمیر میں گزشتہ دو سال سے تجربہ چالو کر دیا گیا ہے۔ اور اس سال ہر مرکز پر طالب علموں کو کتابیں مہیّا کرنے کے لئے خاص انتظامات کئے گئے تھے۔ با الفاظ دیگر ہماری ریاست طریقۂ تعلیم کو بدلے بغیر طریقہ امتحانات بدلنے میں کامیاب رہی ہے اور اس طرح امتحانات کے شعبے میں ہم چاند پر جانے والے امریکیوں سے بھی کئی قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر کسی کو کشمیر کی بے پناہ ترقی میں شبہ ہے تو وہ یقیناً پاکستانی جاسوس ہے۔ اور اسے ملک بدر کر دینا چاہئے۔''۳۰

شمیم احمد شمیؔم کے اس طرح کے طنز و مزاح والے کالم پڑھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ اسی وجہ سے ''آئینہ'' اخبار کے قاری اور کالم نگار کے درمیان ایک ذہنی رشتہ ہموار ہو گیا تھا لیکن یہ کام آسان نہیں تھا جس کو شمیم احمد شمیؔم نے اپنی مختصر سی زندگی میں بھی تقریباً پندرہ سال انجام دیا۔ شمیم احمد کی کالم نگاری میں مزاح کے ساتھ حسن بھی پایا جاتا ہے انہوں نے اپنے قارئین کو نہ صرف تفریح فراہم کی ہے بلکہ ان کی ذہن سازی کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کالم نگاری ایک مشکل فن ہے لیکن اس سے بھی مشکل مزاحیہ کالم نگاری ہے کیونکہ یہ ایسی چیز نہیں جو تربیت سے سیکھی جا سکتی ہے بلکہ اس کے لیے طبعی میلان کا ہونا ضروری ہے اہم واقعات پر تو ہر کسی کی نظر جاتی ہے لیکن غیر اہم واقعہ یا غیر اہم کردار کو روشن کرنا اور منفی رویہ سے مثبت نقطہ نظر کو اپنانے کا عمل مزاحیہ کالم نگار کے یہاں ہوتا ہے۔ سیّد اقبال قادری کا کہنا ہے کہ ایک مزاحیہ کالم نگار کو موضوع کے مثبت و منفی پہلوؤں پر اظہار کرنے کے لیے بہت زیادہ احتیاط برتنا پڑھتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

> مزاحیہ کالم کے انتخاب میں زیادہ احتیاط برتنی ضروری ہے کیونکہ مزاح اور بیہودہ پن کے درمیان بہت ہی ہلکی لکیر ہوتی ہے مزاح اگر ایک خاص سطح پراور خاص حد کے اندر ہوتو گواراور تفریحی ہوتا ہے، اتفاق سے وہ شریفانہ سطح سے ذرہ بھر بھی ہٹ جائے تو وہ ناگواراور سفلیہ ہوتا ہے۔ اردو کے کئی مزاحیہ کالم نویسیوں نے اردو مزاح نگاری کے چمنستان میں نئے گل بوٹوں کا اضافہ کیا ہے۔۳۲

اسی طرح ڈاکٹر عبدالسلام خورشید مزاحیہ کالم نگار کے اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ کالم نویس کو زبان وبیان پر انتہائی عبور حال ہو۔ کلاسیکی اور جدید ادب کا وسیع مطالعہ کر رکھا ہواور اس میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ سنجیدہ بات کا مضحک پہلو بھانپ سکے۔ اس پر تبصرہ کرے لیکن مضحک پہلو بھانپ لینا مشکل ہے اور اس کے بعد اس کو نمایاں کرنے میں بھی طبعی میلان ضروری ہے یہ نہ ہو تو تصنع پیدا ہوگا اور تصنع مزاح کا قاتل ہے''۳۳

مجتبٰی حسین نے مزاحیہ کالم نگاری کو اپنے اور عوام کے دکھوں کو چھپانے اور اجاگر کرنے کے علاوہ ناگوار زندگی کو گوارا بنانے کا نام دیا ہے اس بارے میں انہوں نے کہا تھا۔ پندرہ برس تک لگا تار مزاحیہ کالم نگاری کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ کالم نگاری دراصل اپنے اور عوام کے دکھ کو کبھی خوبصورتی کے ساتھ چھپانے کبھی اسے اجاگر کرنے، درد کے چہرے پر خوشگواری کا مکھوٹا چڑھانے اور ناگوار زندگی کو گوارا بنانے کا نام ہے۔

اردو کالم نگاری اور مزاحیہ نگاری کا چولی دامن کا ساتھ ہے کیونکہ اردو کالم نگاری کی ابتداء ہی مزاحیہ کالم نگاری سے ہوئی، اردو کالم کو فروغ دینے اور اسے مقبول بنانے میں مزاحیہ کالم نگاروں کا اہم رول رہا ہے اور موجودہ دور میں تقریباً ہر اخبار میں مزاحیہ کالم شائع ہوتا ہے۔ مزاحیہ کالم کی اسی اہمیت کے پیش نظر ابتداء سے لے کر آج تک قارئین اسے بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ اردو میں مزاحیہ کالم کی مقبولیت واہمیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں بھی مزاحیہ کالم لکھے جانے کے امکانات روشن ہیں۔

شمیم احمد کے اس چراغ بیگ کالم نے ادبی واور سیاسی حلقوں میں کافی شہرت حاصل کی اور کافی مقبولیت بھی حاصل کی اس میں ادب و سماج اور سیاست سے متعلق مختلف عنوانات کے تحت کالم شائع ہوئے۔شمیم احمد کے یہاں موضوعات کی بھرمار ہے ان گنت موضوعات ان کی تحریر سے سرخ رو ہوئے ہر موضوع اپنی جگہ نہایت ہی دلچسپ اور اہم ہے۔ مشغلے ،مشورے، بے پر کی ،اندیشے، مجلس شوریٰ، تیسرا صفحہ، ریاست کی نامور سیاسی ، ادبی ، اور سماجی، شخصیات کا بھرپور اور مکمل احاطہ کئے ہوئے ہیں۔جس میں قلمی خاکوں کا مختصر روپ پایا جاتا ہے جن میں طنز و مزاح کا عنصر خاصی مقدار میں پایا جاتا ہے۔اس کے علاوہ بھی ان کے بے شمار مضمون جیسے الجھنیں، انکشاف، پیشن گوئیاں ،اندیشے، پرچہ امتحان، مزاح کی چاشنی اور طنز و لطافت میں ڈوبے فن پاروں میں اس دور کی سیاسی سماجی تاریخی اور ثقافتی صورت حال کا مفصل جائزہ لیا ہے۔اگر دور کی سیاسی حالات کو دیکھنا ہے تو اس کے لئے شمیم احمد کا کالم اسمبلی نامہ اور نوک جھونک اس سیاسی ماحول کی بہترین تصویر کشی ہیں اور حقیقت کی عمدہ عکاسی بھی کی ہے۔سیاسی اختلافات کے باوجود بحیثیت مجموعی مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کے آپسی تعلقات خوش گوار اور ہموار تھے۔جس کے نتیجے میں اسمبلی کی کاروائی بڑی جاندار اور دلچسپ ہوا کرتی تھی.

ملاحظہ ہو''اسمبلی نامہ'' سے ایک اقتباس۔

> برادری۔''وزیر فرشتے نہیں ہوتے ان سے غلطیاں سرزد ہوسکتی ہیں۔ ڈی پی صاحب ایک ضمنی سوال کا جواب دے رہے تھے۔'' تو کیا آنریبل انڈسٹریز منسٹر کو اس غلط بیانی کے لئے ڈِس مس نہیں کیا جاسکتا'' شمیم صاحب نے ضمنی سوال پوچھا''میں نے آپ سے عرض کیا کہ وزیر فرشتے نہیں ہوتے'' ڈی پی صاحب نے جواب دیا تو کیا وہ شیطان ہوتے ہیں۔شمیم صاحب نے دریافت کیا۔'' جی ہاں کچھ آپ کی برادری سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ڈی پی صاحب نے برجستہ کہا اور شمیم صاحب لاجواب ہوگئے۔''۳۴

شمیم احمد شمیم ادب سیاست صحافت اور ثقافت جیسے سنجیدہ اور اہم موضوعات کے علاوہ روزمرّہ زندگی

کے چھوٹے چھوٹے اور ہلکے پھلکے واقعات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔لوگ سوچتے ہیں، یک نہ شد دوشد، دلچسپ اطلاعات، اس بات کے مظہر ہیں کہ بظاہر معمولی واقع کو بھی وہ اپنے قلم کی گرفت میں لا کر اس کی اہمیت کو اجاگر کر کے عوام الناس کی ترجمانی کا حق ادا کرتے تھے۔قلی مستان کی کہانی اور پاکستانی ایجنٹ ہندوستانی سیاست اور سیکولیرزم پر کھلی چوٹ ہے۔اوراس کے علاوہ اس میں جدید کشمیر کے کئی ادوار کی بھی تاریخ مرتب کی ہے۔اوراس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں زبان و بیان کو بھی بہت ہی بہتر انداز سے استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو اس کا ابتدائی اقتباس:۔

> ''کشمیر کی جدید تاریخ لکھنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہو رہی ہے کہ نئی نسل کے لئے ابھی تک کوئی مستند، معتبر اور مصدقہ تاریخ نہیں لکھی گئی ہے۔کلہن کی ''راج ترنگنی'' اتنی قدیم ہے کہ اس کے جھوٹ یا سچ کو پرکھنے کے لئے نہ کوئی ذریعہ ہے او نہ ہمارے پاس وقت بعض غیر ملکی سیّاحوں کے لکھے ہوئے تذکرے یا سفر نامے موجود ہیں لیکن یہ بدقسمتی سے انگریزی میں ہیں اور نئی نسل انگریزی سے نا آشنا ہے۔اس لئے ان سے استفادہ کرنا ممکن نہیں ویسے بھی غیر ملکوں کی بات کا کیا بھروسہ؟۔''تاریخ حسن'' کے بارے میں ہماری رائے ہے کہ اس قدر طویل ہے کہ اسے پڑھنے کے لئے بے پناہ فرصت چاہئے اور نئی نسل چونکہ بڑی جلدی میں ہے۔اس لئے اس کے پاس اتنا وقت نہیں کہ طویل کتابوں کے مطالعے میں اپنا قیمتی وقت صرف کرے ویسے بھی اس کی کتابت وطباعت اتنی پھٹیچر ہے کہ اس کو پڑھنے سے نہ پڑھنا بہتر ہے۔صوفی کی لکھی ہوئی ''کشیر'' تاریخ کم اور افسانہ زیادہ ہے۔اس لئے اس کے مطالعے میں وقت صرف کرنے کے بجائے کوئی افسانوی مجموعہ پڑھنا زیادہ بہتر رہے گا۔

ادھر مسٹر پریم ناتھ بزاز اور پی ایم کے بامزئی نے بھی حالیہ تاریخ کے
بارے میں کتابیں لکھی ہیں ۔ بزاز صاحب کی کتاب کی خامی یہ ہے کہ
اس میں بزاز صاحب زیادہ ہیں اور تاریخ کم مسٹر بامزئی
کی تاریخ اس قدر فرضی ہے کہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق ہی
نہیں ۔ الغرض کوئی ایسی تاریخ موجود نہیں ہے جو نئی نسل کے تقاضوں کو
پورا کر سکے اسی لئے ارادہ ''آئینہ'' نے کلہن ثانی جناب چراغ بیگ
سے درخواست کی کہ وہ کشمیر کی تاریخ جدید مرتب فرمائیں ۔ چراغ بیگ
صاحب نے بڑی محنت اور ریاضت کے بعد یہ تاریخ مرتب کر لی ہے
اس تاریخ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں واقعات کی ''صحت کا
خاص خیال رکھا گیا ہے یہ وہ تاریخ ہے جس کو صرف ٹائن بی لکھ سکتا
تھا لیکن اسے لکھ کر چراغ بیگ نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ بھی ٹائن بی
سے کم نہیں ۔'' ۳۵

شمیم نے ایک بہترین کالم نگار کی طرح واقعات و حادثات کو بڑے ہی دیانت داری سے جمع کر کے پوری تفتیش و تحقیق کر کے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کیونکہ ایک ذہین کالم نگار روزمرہ کے واقعات کا بہترین نقاد ہوتا ہے ۔ شمیم احمد کا فن زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے انھوں نے زندگی کے اتار چڑھاؤ اور زمانے کی روش، عوام کے ذہنی فکری رجحانات کو خوب سمجھا اور نہایت سنجیدگی سے اپنی تحریروں میں بیان کر دیا ہے ۔

ان کے مزاحیہ کالم میں بعض جگہوں پر طنزیہ جملے خاصے کی چیز بن جاتے ہیں ۔ انھوں نے اپنے کالموں میں اسلوب کی بنیاد شرافت، شائستگی، پر قائم کی ہے ۔ شمیم احمد اپنے کالموں میں کئی جگہ پر دوسروں پر جملے بھی کستے ہیں اور تمسخر بھی اڑاتے ہیں وہ حتی الامکان جانب داری سے احتراز کرتے ہیں اور اپنی متانت اور اخلاقی اقدار کی پاسداری کو قائم رکھتے ہیں ۔ شمیم احمد شمیمؔ نے ہمیشہ مزاح برائے مزاح کی بجائے مزاح برائے اصلاح پر زور دیا اور ان کا طنز ہمیشہ مصلحانہ اور مقصدی ہوا کرتا تھا جس میں علم و فراست، دانش و آگہی سے پُر ہوتے تھے ۔ انھوں نے اپنے کالموں میں

مختلف موضوعات پرقلم اٹھایا اور کامیاب بھی رہے ان کی زندگی کا ایک طویل حصہ کالم لکھنے میں گذرا ہے۔

شمیم احمد شمیمؔ اپنے کالموں کو عوام میں مقبول کرنے کے لئے دل چسپ موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ ادبی، سیاسی، اور مزاحیہ کالم تحریر کرکے عوام کی رائے عامہ کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ اپنے کالموں کا مواد اپنے سماج اور روز مرّہ زندگی سے لیتے ہیں اور کبھی گردو پیش کے حالات و واقعات کو کالم کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات کسی ایک دائرے میں قید نہیں ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کالموں میں اپنے دور کے کسی واقعہ یا مسئلہ کو بنیاد بنا کر کالم کی ابتدا کرتے تھے، تو کبھی پرانے معاملات و مسائل کو زیر بحث لاتے ہ تھے۔ مثلاً کبھی وہ آفسروں کی بے حسی اور بدحواسیوں کو منظر عام پر لاتے ہیں، کبھی صحافیوں کی کمیوں کو گنواتے ہیں کبھی محکموں کی کرپشن کو سامنے لاتے ہیں کبھی سیاسی لیڈروں کی بے ایمانیوں کا راز فاش کرتے ہیں۔

شمیم احمد شمیمؔ کا مقصد صرف یہ ہے کہ کس طرح معیار زندگی کو بلند کیا جاسکتا ہے اور عوام کے لئے کس طرح زیادہ سے زیادہ آسانیاں پیدا ہوسکتی ہیں ان کے موضوعات براہ راست عوام کی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں۔ وہ جیتی جاگتی زندگی کے مسائل اور حقائق کو پیش کرتے ہیں بالخصوص ریاست کے نچلے اور متوسط طبقے کی زبان اور طرز زندگی کو ایک خاص رنگ میں بیان کرتے ہیں وہ بڑے ہی سلیقے سے سماج کے تمام مسائل جو کہ مفلس عوام سے متعلق ہوتے ہیں ان کو بیان کرتے ہیں۔ شمیم احمد شمیمؔ صائب الرائے شخص تھے جو اپنے علم، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں مخصوص معیاروں کی کسوٹی پر رائے قائم کرتے ہیں پھر مضبوط دلائل سے نہایت ذکاوت وفراست سے اپنے خیالات ومصائب کا اظہار کرتے ہیں مثلاً ''تعلیمی کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال''۔ طنزیہ ومزاحیہ انداز میں لکھتے ہوئے ان کا طنز زہریلا نہیں رہتا بلکہ وہ ایسا شگفتہ انداز اپناتے ہیں کہ زندگی کی بدحال صورت کو بھی مزاح کی چاشنی کے ساتھ پیش کرتے ہیں:۔

شمیم احمد شمیمؔ اپنے کالموں میں معاشرتی ناہمواریوں اور عوام کے دکھ درد کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری اس بات کے لئے پریشان ہوجاتا ہے کہ وہ روئے یا ہنسے۔ صحافت کا مقصد صرف لوگوں تک معلومات بہم پہچانا ہی نہیں ہوتا بلکہ حقائق کی روشنی میں لوگوں کے لئے راہ عمل بھی بتانا ہوتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے ایک صحافی کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ وہ واقعات وامکانات کی پوری چھان بین اور دیانت داری کے ساتھ تجزیہ بھی کرتا ہے اور پھر

اپنی رائے کا آزادانہ طور پر اظہار کرتا ہے۔

شمیم احمد شمیمؔ ہمیشہ اپنی آنکھیں کھلی رکھتے تھے اوران کی بصیرت ہر وقت نت نئے نکات پر غور وفکر کرتی تھی اور وہ ہر چھوٹے بڑے مسائل پر یکساں توجہ فرماتے تھے۔انہوں نے اخلاقی و معاشرتی ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے عوام کے ذہنی رجحانات،قومی اور ملکی فلاح و بہبود کے لئے کام کیا۔صداقت ان کے شعار میں داخل ہے وہ اپنے کالموں میں غریب عوام کی بے چارگی اور بے بسی کو ابھار کر منظر عام پر لاتے ہیں وہ استحصالی معاشرے میں موجود بے کس عوام کے روایتی انداز کو بڑے کرب سے اپنے کالموں میں پیش کرتے ہیں انھوں نے اپنے کالموں میں کھیل ، معاشرہ،معیشت، کاروبار، سیاست، سائنس، طب اور فیشن غرض ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔اور جگہ جگہ چراغ بیگ کے ہی تذکرے ہوا کرتے تھے۔

شمیم احمد شمیمؔ نے آئینہ کے تیسرے صفحے میں نہایت محنت سے موضوع تلاش کر کے نئے اور اچھوتے انداز سے اظہار خیال کر کے چراغ بیگ کو زندہ کر دیا ہے ان کے ہر جملے میں جذبہ اور لطف بھرا ہوتا ہے۔تحریر میں آمد اور روانی کا احساس ملتا ہے۔اور قاری ان کی تحریر کے سحر میں تا دیر گرفتار رہتا ہے اس مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے کبھی وہ طنز کے تیر ونشتر چلاتے ہیں اور کبھی شگفتہ انداز سے گفتگو کرتے ہیں۔شمیم احمد شمیمؔ کے کالموں میں فکر اور اظہار و بیان کی مکمل صلاحیت موجود ہے ان کے سیاسی ، ادبی، تہذیبی، اور شخصی اقسام پر مشتمل کالم بڑے واضح اور متوازن ہیں۔وہ نہایت بے تکلفی سے بلا رکاوٹ لکھتے ہیں وہ شخصیات کو طنز کا نشانہ تو بناتے ہیں لیکن ایسا کرتے وقت وہ شائستگی و ہمدردی کے عناصر کو فراموش نہیں کرتے ہیں۔

شمیم احمد شمیمؔ جب کسی موضوع پر کالم تحریر کرتے ہیں تو ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی ایک واقعہ یا کسی شخص کے منفی رجحانات پر تنقید وتبصرہ کر کے اس کی اصلاح کی جائے وہ اہل اقتدار اور دیگر حاکموں پر بہت ہی راز دارانہ انداز سے نشان دہی کرتے ہیں۔اور جب کسی مسئلے پر اظہار خیال کرنا ہوتا ہے تو اس کے لئے تمہید باندھتے ہیں اور قاری کو ذہنی طور پر بات سننے کے لئے تیار کر لیتے ہیں۔وہ معاشرے میں پھیلی ہوئی تمام برائیوں پر بے لاگ لکھتے ہیں اور چونکہ وہ خود ایک مہذب انسان ہیں اس لئے وہ بدتہذیبی اور بدعنوانی کے ناسوروں پر نشتر زنی کرتے ہیں مگر ان کے نشتر زہر آلود نہیں ہوتے ہیں اور شاید اسی میں ان کی کامرانی ہے۔ان کے ہر مضمون میں اصلاح معاشرہ کی

کوشش ہوتی ہے اوران معاشرتی برائیوں کی نشان دہی بہت شگفتہ انداز میں کرتے ہیں۔انھوں نے رشوت، لوٹ مار، چوری، ملاوٹ، بدعنوانی اوراخلاقی اقدار کی پامالی کے واقعات کوقاری کے لئے بہت ہی مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔

شمیم احمد شمیؔم ایک ترقی پسندانہ ذہنیت کے باوجودانتہا پسندی کے ساتھ ساتھ اعتدال پسندی کی راہ بھی اختیار کی۔ وہ منٹؔو سے بھی کافی متاثر تھے۔اور ملک کے غریبوں کو جاگیرداروں، سرمایہ داروں کے شکنجے سے نجات دلاکر مساوات اورانصاف پسندی پرمبنی نظام لانے کے خواہش مند تھے۔انھوں نے معاشرے کے ہر پہلو کو کھلی آنکھ سے دیکھا اور محسوس کیا اسی دردوفکر نے ان کو سیاسی میدان میں کودنے پر مجبور کیا انہوں نے دیکھا کہ سیاسی خلفشار اور معاشی عدم توازن میں اضافہ ہورہا ہے جس کے باعث معاشرتی تقسیم دوطبقوں تک محدود ہے۔ وہ معاشرے میں سماجی نابرابری اور معاشی بحران سے بہت بےچین ہوتے ہوئے اپنی تحریروں میں نظرآتے ہیں اوران کے متعلق اپنے کالموں میں اظہار کرتے ہیں ان کے کالموں میں بےکس مظلوم عوام کی چیخ و پکار بھی سنائی دیتی ہے۔ وہ بھوک، جبر، ظلم وستم، ناانصافی کے خلاف پرزوراحتجاج کرتے ہیں۔

شمیم احمد شمیؔم اپنے کالموں میں افراد کی بےحسی اوراقدار کی شکست کا نوحہ طنزیہ انداز میں پیش کرتے ہیں کیونکہ ہمارے سماج اور معاشرے میں بددیانتی انتہا درجے کو پہونچ چکی ہے لوگ منافع کمانے کے چکر میں گھٹیا سے گھٹیا کام کررہے ہیں۔انھوں نے سیاست کے موضوع پر بھی خوب کالم لکھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ، شمیم احمد شمیؔم کے پاس مشاہدے کی کمی نہیں۔شمیؔم سیاسی موضوعات اورخبروں پرایک مقرّرانہ انداز سے بحث کرتے ہیں،ان کی طبیعت میں ظلم کے خلاف ایک آگ تھی جوان کے ضمیر کوخاموش نہیں ہونے دیتی تھی ان کالموں میں شمیم احمد شمیؔم اشارتاً، کنایتاً اورمزاحیہ انداز میں سیاسی تجزیہ پیش کرکے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

شمیم احمد شمیؔم اپنے کالموں میں قارئین کو نئے نئے مفہوم، نت نئے افکاروخیالات سے روشناس کراتے ہیں۔اپنے منفرد انداز فکراور طرز نگارش سے قارئین کا دل جیت لیتے ہیں اور مخاطب ان کی حاضر دماغی، اور حاضر جوابی اورخوش کلامی کا معترف ہوجاتا ہے۔ان کے کالموں میں تہہ درتہہ مفہوم چھپا ہوا ہوتا ہے۔ کالم کا ظاہرو باطن ایک نہیں ہوتا۔شمیم احمد شمیؔم بعض اوقات ایک بات کرتے ہیں لیکن باطن میں اس سے کئی نئے مفہوم اورشرح

ہوتی ہیں۔شمیم احمد شمیم کے کالموں میں زبان و بیان کی شیرینی اور شگفتگی بھی ملتی ہے جو قارئین کومحظوظ کرنے کے ساتھ ساتھ تفریح کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہے۔

مزاح اس شگفتہ کیفیت کا نام ہے جو ماحول کی ناہمواریوں اور بے ربطیوں سے پیدا ہوتا ہے اِن بے ڈھنگی چیزوں کو دیکھ کر قاری میں بھی مسکرانے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔شمیم احمد شمیم ماہر فن کار کی طرح اپنے گرد وپیش کے ماحول کی ناہمواریوں کو دریافت کرتے ہیں اور انھیں ہمدردانہ شعور کے ساتھ نہایت ہنرمندی سے پیش کرتے ہیں کہ قاری خندہ زیرلب کی کیفیت سے ہم کنار ہوجاتا ہے۔

شمیم احمد شمیم کے کالم جذباتی اور لفظی گھن گرج سے یکسر پاک ہوتے ہیں۔وہ اپنا مدعا نہایت سادگی اور وشستگی سے بیان کرتے ہیں۔وہ اپنے کالموں میں سنجیدگی،متانت اور ظرافت کا حسین امتزاج رکھتے ہیں۔آئینہ کے ان کے کالموں کا ایک خاص وصف شمیم احمد شمیم کا اسلوب ہے جو قوت توانائی اور شدت جذبات سے پُر ہے۔ ان کی اپنے موضوع اور مواد سے دلچسپی ہر جملے اور فقرے میں رچی بسی ہے۔شمیم احمد شمیم کے اسلوب کا اہم وصف موازانہ ہے موازانہ دو اشیا دو اشخاص کے مابین تقابلی صورت ہے جو مشابہت اور تضاد کو نمایاں کرتی ہے۔ان کے کالموں کا ایک اہم وصف اختصار اور جامعیت ہے جس کو وہ بڑی ہی ہنرمندی سے برتتے ہیں۔

شمیم احمد شمیم ایک کامیاب کالم نگار ہیں وہ ترقی پسند تحریک سے شعوری غیر شعوری طور پر متاثر تھے۔ اس تحریک کے اثرات ان کی نگارشات میں درآئے ہیں وہیں وہ اپنی انفرادیت کا علم بھی سر بلند رکھتے ہیں اور یہی انفرادیت ان کے مقام و مرتبہ کا تعین بھی کرتی ہے۔ان کے کالموں میں جذبہ بھی ہے اور تہذیب یافتہ عمل کی ترغیب بھی،فقر واستغنا بھی اور ہنگامہ خیزی بھی۔شمیم احمد شمیم کبھی بھی اپنے کالموں میں ایک واعظ وخطیب کے مانند قاری کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے کالموں میں ایسا دھیما پن ہے جو ذہن کو مشتعل کرنے کے بجائے فکر و دانش کی مشعل جلاتی ہے یہی ان کی انفرادیت ہے۔

****

شمیم احمد شمیم کی اداریہ نگاری۔

آئینہ کی اداریہ نگاری شمیم احمد شمیم کی تاریخی اور بصیرت افروز تحریریں ہیں۔ جو اپنے دور کی بہترین عکاس ہیں۔ جن میں کشمیر کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی پسِ منظر میں سیاسی اور تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ اداریے آج سے تقریبا پچاس سال پہلے کے لکھے ہوئے ہیں۔ جو آج بھی ریاست جموں وکشمیر اور پورے ملک کی صورت حال کے عین مطابق ہیں۔ کشمیر کی سیاسی اور غیر یقینی صورت حال ہو یا دفعہ 370 کی برقراری ہو افسپا اور پوٹا جیسے کالے قوانین کی مخالفت ہو سیکولرزم کی علم برداری ہو اور فرقہ پرستوں کے کالے کرتوت ہوں اور فرقہ وارانہ فسادات اور حکومت ہند کی ذمہ راد یاں اخلاقیات کا زوال ہو یا سماج کی پسماندگی ہو۔ غریب اور پسماندہ لوگوں کے مسائل ہوں یا ریاست کے مضافات کے پہاڑی قبیلوں کے مسائل ہوں، ریاستی حکومت کی نا اہلیاں ہوں غرض ہر مسئلے پر آئینہ کے مدیر کا بھر پور آواز بلند کرنا، تاریخی اہمیت کے حامل ہے۔

ریاست کی مخصوص صورت حال اور دونوں مما لک ہندو پاک کے آپسی تعلقات، آمدرفت، دونوں مما لک کے درمیاں انتہا پسندوں کی طرف سے تعلقات کی بحالی کی مخالفت اور سرحدوں پر کشیدگی اور غریب اور پسماندہ گجرآبادیاں جو سرحد کے دونوں طرف آباد ہیں۔ اور دونوں جانب سے گولہ و بارود کا نشانہ بنتے ہیں وہ سارے کے سارے مسائل جو آج سے پچاس سال پہلے تھے وہ آج بھی جوں کے توں برقرار ہیں ان میں کمی کے بجائے بڑھوتری ہی ہو رہی ہے۔ اور ان مسائل کے حل کا کوئی ٹھوس قدم بھی نہیں اٹھایا جا رہا ہے اور اگر اس کے جانب کوئی حل کے تلاش کی کوشش بھی کرے بھی تو یہ انتہا پسند اور فرقہ پرست طاقتیں اس کی آڑ میں آجاتی ہیں۔

شمیم نے اپنے ان تمام موضوعات کو اپنے اخبار آئینہ میں جگہ دی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اداریہ اخبار کی روح، جان، دل، دماغ، چہرہ، پیشانی اور آنکھ سب کچھ ہوتا ہے۔ کیوں کہ اداریے سے ہی اخبار کی پالیسی اور معارکا پتا چلتا ہے اور اخبار کی سوچ، فکر اور رائے اغراض و مقاصد کا صحیح طور پر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر ان تمام چیزوں کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو ''آئینہ'' اس پر پورا پورا اترتا ہے۔ آئینہ کا اپنے دور میں معیار اس لئے بھی بلند تھا کہ ''آئینہ'' اخبار بھی اور خصوصاً اداریہ غیر جانب دار، پراثر، زوردار اور با مقصد تھا اسی لئے اس اخبار کا معیار بھی کافی بلند تھا۔

آئینہ کے اداریہ کو صاحب ''آئینہ نے اخبار کی روح و جان بنایا تھا کیوں کہ خود انکا ماننا تھا کہ میرے اخبار کو میرے ا

داریوں سے ہی زندگی مل سکتی ہے یہی وجہ تھی کہ'' آئینہ'' کا اداریہ نہایت ہی معیاری اور با مقصد ہوا کرتا تھا اسی لئے اس اخبار کو پزیرائی حاصل تھی۔ آئینہ کا اداریہ دراصل شمیم احمد شمیمؔ کے ضمیر کی آواز بہت ہی واضح طور پر سنائی دیتی ہے گویا عوام کی وہ باتیں جو وہ کہنا چاہتے ہیں اس میں نظر آتیں ہیں۔ ہر اداریے کو دل کی آواز اور حکمت عملی کے تحت سوجھ بوجھ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور حقائق کو سامنے لایا گیا ہے۔

یہ اداریے نہایت ہی خوبصورت ہوا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے آئینہ کے قاریوں کو ہفتے بھر اخبار کا انتظار رہتا۔ دراصل صاحبِ'' آئینہ'' نے اپنے اخبار کے زریعہ سماج کو آئینہ دکھایا ہے اور اسی وجہ سے سماج میں اس کی قدر و قیمت بھی زیادہ تھی۔ آئینہ کے اداریوں میں ہمیں سماج کی گہری چھاپ ملتی ہے ویسے بھی شمیم احمد شمیمؔ کی حالات حاضرہ پر بڑی گہری نگاہ تھی۔ چیزوں کو نہایت ہی باریک بینی سے دیکھا کرتے تھے۔ اور خوبیوں کیساتھ خامیوں اور اچھایوں کے ساتھ برائیوں کی بھی نشان دہی کرتھے تھے۔ ملاحظہ ہو آئینہ کے اداریے کا ایک اقتباس۔

'' موئے مبارک کی ایجیٹیشن کے دنوں میں جب عوام کے ضبط و نظم کا پیمانہ چھلک گیا تھا تو مولانا محمد سعید مسعودی نے جوش میں آئی ہوئی قوم کو عقل کا چراغ جلائے رکھنے کے لئے ایک جادو اثر لفظ کا تحفہ دے دیا تھا۔ ہوشیار۔!. جب بھی کسی جگہ حالات میں زرا تلخی کا شائبہ پیدا ہو جاتا۔'' ہوشیار'' کی آواز گونج اٹھتی۔ موئے مبارک کے دوران کسی قسم کے فرقہ وارانہ یا اسی نوعیت کی کسی دوسری ناچاقی کے بپانہ ہونے میں اس چھوٹے سے لفظ کا بھی اپنا حصہ ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہی لوگ جو اس نعرے کی بجلی چمکا کر دوسروں کو راستہ دکھاتے تھے اب پانچ چھ مہینے گزر جانے کے بعد یہ لفظ خود ہی بھول گئے ہیں۔ شہر کے مختلف حصوں میں گتھم گتھا ہونے والوں کی خدمت میں سیاسی جماعتوں کے قائدین کی خدمت میں، حکومت کے اکابرین کی خدمت میں اور صحافت کے عمائدین کی خدمت میں آج اسی لفظ کی گونج پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہوشیار ہوشیار۔ ہوشیار۔! ہماری تحریک آزادی کے بچپن

میں جب ذہنوں پر غلامی کے جھولے اور آنکھوں پر جہالت کے
پردے لٹک رہے تھے تو شہر میں شیر بکرا لڑائی کی باتیں سننے میں آتی
تھیں۔میری نسل کے لوگ جن کا شعور آزادیِ ہند کے ساتھ ساتھ
جوان ہوا۔جب اس معرکہ آرائی کے قصے سنتے تھے۔تو ہمیں یقین نہیں
آتا تھا کہ ایسی مہمل بات ممکن ہوسکتی ہے۔ہمیں ان لوگوں کی جہالت پر
رحم آتا تھا جو تیسری دھائی میں شیر اور بکرے کے نام پر لڑا کرتے
تھے۔ہمیں پورا یقین تھا کہ اب اس قسم کی واہیات لڑائیوں کا زمانہ گزر
گیا ہے لیکن 1964ء میں یہی ناشدنی حقیقت بن کر سامنے آرہی
ہے۔اور میں حیران ہوں کہ گزشتہ تیس برس کے عرصے میں چل پھر کے
کیا ہم 1934ء کے دور جہالت میں پھر واپس پہنچ گئے ہیں۔"۳۶

شمیم احمد شمیم نے آئینہ کے اداریے نہایت ہی بے باکی سے تحریر کئے ہیں۔ان کے یہاں کسی بھی قسم کی جانب داری نظر نہیں آتی۔وہ حقائق کو بیان کرنے میں زرا بھی ہچکچاتے نہیں۔ بلکہ بڑی جوان مردی سے لکھتے ہوئے چلے جاتے تھے۔صحافت کا اصل مقصد بھی یہی ہے جس کو شمیم احمد شمیم نے عملی جامہ پہنا کر دکھایا۔ویسے تو ہندی اور انگریزی اخبارات میں اداریہ لکھنے کی ایک ٹیم ہوتی ہے جس میں شامل ہر شخص اپنے اپنے موضوع کا ماہر ہوتا ہے کوئی تاریخ کا ماہر ہوتا ہے کوئی سماجیات کا ماہر ہوتا ہے کوئی طبعیات اور فلکیات کا ماہر ہوتا ہے جب جس موضوع پر اداریہ لکھنے کے ضرورت محسوس ہوتی ہے اس پر اداریہ لکھنا متعلقہ موضوع کے ماہرین کی زمہ داری ہوتی ہے۔لیکن اردو اخبارات میں کوئی الگ ٹیم نہیں ہوتی بلکہ اخبار کا عملہ ہی سارے کام انجام دیتا ہے لیکن شمیم احمد شمیم واحد شخص تھے جو اپنے آپ میں ایک عملہ تھے ایک انجمن تھے جو سارے کے سارے کام خود ہی کیا کرتے تھے۔اداریہ خود لکھتے، کالم خود لکھتے دوسرے تمام تر کام خود انجام دیتے یہاں تک کہ آئینہ میں شمیم کی ننانوے فیصد تحریریں ہوا کرتی تھی۔

آئینہ کے اداریوں میں موضوع کی مناسبت سے تمام اہم تفصیلات بیان کردی جاتی تھیں تاکہ قاری موضوع کی نوعیت اور سچائی سے بخوبی واقف ہو سکے اور اکثر ایسا بھی کیا گیا ہے کہ جس موضوع پر اداریہ لکھا گیا ہے اس کی ابتدا میں موضوع سے متعلق تمام بنیادی باتوں کو بیان کردیا جاتا تھا۔اور اس سے آئینہ کے قاری واقع کے

پسِ منظر سے بخوبی واقف ہوجاتے تھے۔ شمیم احمد شمیمؔ نے ''آئینہ'' کے اداریے خاص خاص موضوعات پر لکھے ہیں۔ اور یہ اداریے قارئین کی دلچسپی کو مدِّ نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں جن میں ہوشیار، یہ اضطراب کیوں، نیا مشن، نامناسب نظر بندی، تفریح کا مسئلہ، غیر دانشمندانہ تعجل، ہوش کی باتیں، وہ کانگریس کہاں ہے، حقائق سے فرار، کشمیر ایڈمنسٹریٹیو سروس، جنگ کے دروازے پر غیر متزلزل اعتقاد، نیادور، نئی منزلیں، انصاف کے تقاضے، اعترافِ شکست اول، اعترافِ شکست دوم، فریبِ تاشقند، چراغ تاشقند، طالب علموں کی نظر بندی، بخشی صاحب کی مراجعت، کشمیری صوبہ، چراغ بجھ رہا ہے، یہ خودساختہ نمائندے، ایک اہم فیصلہ، نئے مسیحا، میرا فیصلہ، یہ چلتے پھرتے جہنم، مجھے کچھ کہنا ہے، شاندار فتح، گناہِ بے لذّت صدارتی انتخابات، 7 جون، فتح کس کی، پنڈت بھائیوں سے گزارش، توہینِ قرآن کا مسئلہ، فرقہ وارانہ فسادات اور مرکز، آمدورفت کا مسئلہ، مزاکرات، پسِ منظر اور پیش رفت، بنیادی حقوق کا فریب، غلام نبی گلکار، شہید آرزو، ایک اہم تاریخی اجتماع، اتحاد کا نشان، ہنگامی حالات کے ہنگامے، گائے کے فائدے آلو اور آزادی، نیشنل کانفرنس کے احیاءِ نو، جیسے بے شمار مضامین پر آئینہ کے اداریے لکھے جاتے تھے۔ طالب علموں کی نظر بندی کے نام سے ان کے ایک اداریے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''جب آنے والا مورّخ موجودہ حکومت کے خلاف فردِ جرم مرتکب کرے گا تو اس میں نوعمر، کمسن اور نادان بچوں کی مسلسل نظر بندی کا الزام سرِ فہرست ہوگا۔ تہذیب، شائستگی اور جمہوریت کے نام پر برسرِ اقتدار آنے والی حکومت کے لئے یہ امر کتنا شرمناک ہے کہ اس کی جیلوں میں آج چار ماہ سے تین سو سے زائد طالب علم نظر بند ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ان میں 14 سے 18 سال تک کے کم سِن نوعمر بچے بھی شامل ہیں طالب علم کی معصومیت اور بے گناہی کا واسطہ دے کر حکومت سے ان کی رہائی کا مطالبہ نہیں کرتے کیوں کہ ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ طالب علموں نے ہلڑ بازی اور ہنگامہ آرائی کر کے حکومت کو اس سخت قدم پر مجبور کر دیا تھا۔

لیکن ہم حکومت کے سربراہوں کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ سزا کی شدّت کا تعلق جرم کی نوعیت سے ہوتا ہے۔ افراد کے نفسیاتی ردِّعمل سے نہیں جن طالب علموں کے خلاف توڑ پھوڑ کی کار وائیوں میں حصہ لینے کے الزامات ہیں ان کے خلاف با قاعدہ مقدمے چلائے جانے چاہیں اور انہیں مناسب سزا دی جانی چاہیے لیکن اکثر طالب علموں کو تقریر کرنے ،نعرہ لگانے ،یا جلوس میں شرکت کرنے کی پاداش میں نظر بند رکھا گیا ہے۔ ان جرائم کے لئے مہینے ڈیڑھ مہینے کی نظر بندی کافی تھی لیکن حکومت انصاف اور شائستگی کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر انتقامی کاروائی پر اتر آئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ریاست میں مکمل امن وامان ہونے کے بعد بھی ان طالب علموں کو رہا نہیں کیا جاتا۔ ناپختہ اور کمسن بچوں کو سیاسی لیڈروں اور کارکنوں کی سطح پر نہیں رکھا جاتا اپنی ذہنی ساخت اور نا تجربہ کاری کی بناء پر ان سے اس تدبر اور دور اندیشی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی جس کی عدم موجودگی نے انہیں بعض ناپسندیدہ سرگرمیوں میں حصہ لینے کی ترغیب دی اکثر بچے سیاسی جماعتوں کے آلہ کار بن گئے ہیں۔ بعض یہ جانے بغیر کہ ان کی منزل کیا ہے ہنگاموں میں شریک ہوگئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ماحول کی یکسانیت اور بے رنگی سے تنگ آ کر زندگی میں کوئی ہل چل چاہتے تھے اور چند ایک ایسے بھی ہیں۔ کہ جنہیں صرف اس لئے محبوس رکھا گیا ہے کہ کسی سراغ رساں کو ان کے کسی عزیز کا کوئی پرانا قرضہ چکانا تھا۔

بہر حال وجوہات کچھ بھی ہوں سزا کی شدّت اور جرم کی نوعیت

کے ساتھ ساتھ مجرم کی عمر اور اس کی ذہنی سطح کو بھی مدِّ نظر رکھنا چاہئے
لیکن صادق صاحب کی مہذب دورِ حکومت میں ایسا بھی ہوا ہے کہ کچھ
کمسن بچوں کو پولیس کی گاڑیوں میں جیل لے جاتے ہوئے اس قدر
پیٹا گیا کہ آج تین ماہ بعد بھی ان کے زخم مندمل نہیں ہو سکے ہیں۔ ہم
جانتے ہیں کہ صادق صاحب کو اس کا علم نہیں ہے لیکن ہم یہ جاننا چاہیں
گے کہ صادق صاحب کو اس بات کا علم کیوں نہیں ہے ان کی لاعلمی انہیں
اس سانحہ کی اخلاقی زمہ داری سے آزاد نہیں کر سکتی ہم ایسی تمام چھان
بین کا مطالبہ کرتے ہیں جہاں کمسِن اور معصوم بچوں کو نہایت بے کسی
اور بے بسی کی حالت میں زدوکوب کیا گیا یا انہیں جسمانی اذیّتیں دی
گیں''۔ ۳۷

شمیم احمد شمیمؔ کی جانکاری بہت ہی پختہ تھی جب بھی وہ کوئی اداریہ لکھتے تو اپنی بات کو دلائل، حقیقت اور مثالوں سے پیش کرتے ہیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کا مطالعہ نہایت ہی وسیع تھا آپ صرف ریاست اخبار ہی نہیں بلکہ قومی اور بین الاقوامی اخبارات کا بھی بڑی پابندی سے مطالعہ کرتے تھے۔ ایک اڈیٹر اور اداریہ نگار کے لئے اخبارات کا مطالعہ نہایت ہی ضروری اور لازمی بھی ہے۔ شمیم احمد شمیمؔ کے اخبار میں بین الاقوامی خبریں اور موضوعات کو بھی جگہ ملتی ہے جس سے قارئین کو نہ صرف ریاست بلکہ ملک اور پوری دنیا کی بھی جانکاری ملتی رہتی ہے۔ اور ان تمام مباحث کو بھی منظر عام پر لایا جاتا جن پر بین الاقوامی سیاست کے مسائل ہوتے ہیں اور موضوع کو با قاعدہ ایک مکمل صورت میں پیش کیا جاتا۔ اس طرح اداریہ لکھا جاتا تھا کہ کوئی بات تشنہ نہیں رہتی تھی اور شمیم احمد شمیمؔ موضوع سے مکمل انصاف کرتے تھے ان کے اداریوں میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ کہ موضوع کا ہر پہلو قلم کی ذد میں آ گیا ہے۔ موضوع کے دونوں رخ کو بیان کیا گیا ہے جہاں ایک طرف دلائل سے ہر بات بیان کی گئی ہے وہیں اداریے سے سنجیدگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔

شمیم احمد شمیمؔ نے'' آئینہ'' کے اداریوں میں اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے جب کہ اداریہ نگار اپنی

رائے کے اظہار میں اخبار کی پالیسی پر منحصر ہوتا ہے اور اکثر اداریہ نگار اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے بلکہ اخبار کی پالیسی کے تحت اپنی بات مکمل کرتے ہیں لیکن آئینہ میں شمیم احمد شمیم اپنی رائے کا اظہار اس لئے کرتے تھے کہ آئینہ تھا ہی شمیم احمد شمیمؔ کی شخصیت جس کو آئینہ کے سوا شمیم نامہ بھی کہا گیا ہے اس لئے وہ اکیلے ہی تقریباً اس اخبار میں لکھتے تھے اور اداریہ میں بھی ضروری تھا کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کریں اور انہوں نے ہر موضوع پر اپنی اور اپنے اخبار کی رائے کو شامل کیا ہے۔

آئینہ'' کے اداریوں میں شمیم احمد شمیم نے ہمیشہ زبان و بیان، قواعد الاوقاف وغیرہ کا خاص خیال رکھا ہے۔ پامال فکروں کے استعمال سے بچنے کی کوشش کی ہے اور اپنی بات کو مربوط جملوں میں کہا ہے غیر ضروری تفصیلات سے بھی پرہیز کیا گیا ہے ناموں اور مقامات کے ناموں کو پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ موضوع سے متعلق مواد کو نہایت ہی چھان بین سے لکھا گیا ہے۔ اصطلاحات کا ستعمال بھی ان کے یہاں خوب ملتا ہے۔ شمیم احمد شمیمؔ کے لب ولہجہ اور زبان کی ادائیگی میں نزاکت پائی جاتی ہے۔ بات عام فہم اور سادہ زبان میں کہتے تھے لیکن ان کے جملوں کی ساخت بہت ہی عمدہ ہوتی تھی۔ تحریر میں ایسی روانی ہے کہ آدمی پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ آئینہ کی سرخیاں بھی نہایت ہی عمدہ ہوا کرتیں تھیں۔

پنڈت بھائیوں سے گزارش

فرقہ وارانہ فسادات اور مرکز

گائے کے فائدے

اتحاد کا نشان

مزکورہ اداریوں کی سرخیاں پڑھ کر مضمون کی طرف خود بخود قاری چلا آتا تھا اور مضمون کو پڑھے بغیر نہیں رہتا تھا دراصل یہ شمیم کی زبان کی مٹھاس تھی۔ جو آئینہ پڑھنے والوں کی پسندیدہ بن گئی تھی۔ ویسے گائے کے فائدے پہ تو ہم سب نے بہت سارے مضمون سنے ہیں اور بچپن سے پڑھتے بھی چلے آئے ہیں۔ کہ گائے کے فائدے کیا کیا ہیں۔ دیکھئے شمیم احمد شمیم گائے کو اپنے ادارئے میں کس طرح پیش کرتے ہیں ملاحظہ ہو:۔

''رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے ہماری گائے بنائی

خاکسار چراغ بیگ نے یہ شعر تیسری جماعت میں یاد کر لیا تھا۔ ان دِنوں والد صاحب کہیں سے ایک موٹی تازی گائے خرید کر لائے تھے۔ اور میں دن میں گائے کے سامنے کئی مرتبہ یہ شعر دہراتا میرا خیال تھا کہ اپنی تعریف سن سن کر گائے زیادہ دودھ دے گی اور اس طرح میرے دودھ کا کوٹا بھی بڑھ جائے گا۔۔۔۔۔۔۔ہاں تو میں اپنی گائے کا ذکر خیر کر رہا تھا۔ کہ بڑی پیاری صحت منداور مفید گائے تھی۔ ان ہی د نوں ماسٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا کے گائے کے کیا فائدے ہیں۔ میں نے پھٹ سے جواب دیا کہ گائے دودھ دیتی ہے میرا سر چاٹتی ہے یہی اس کے فائدے ہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ماسٹر صاحب نے گائے کے اور بھی فائدے بتائے تھے۔ مثلاً یہ کہ گائے کے گوبر کو جلایا جاتا ہے گائے سال میں ایک بار ایک بچھڑا دیتی ہے مرنے کے بعد گائے کے چمڑے سے جوتے بنتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

میں ماسٹر صاحب کی علمیت کا بے حد قائل ہوا کہ ان کی دور بین نگاہوں نے گائے کے متعلق کتنی معلومات فراہم کیں جب سے آج تک ماسٹر صاحب کی عزت واحترام کا جز بہ بدستور موجود ہے لیکن پچھلے دو ایک ہفتوں سے اس جز بے میں کسی قدر کمی ہوئی ہے بلکہ ماسٹر صاحب سے ناراض بھی ہوں کہ گائے کے بہت سے فائدے بتاتے ہوئے انہوں نے مجھے ''اصلی گائے'' سے ناواقف رکھا۔ ابھی حال میں مجھ پر یہ راز کھل گیا کہ گائے کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ اس کے نام پر الیکشن بھی لڑا جا سکتا تھا۔ پچھلے دنوں بھارتیہ جن سنگھ نے گائے کے تیئں اپنی محبت، عقیدت، اور شجاعت، کا جو مظاہرہ کیا، اس سے یہ بات

ثابت ہوگئی ہے کہ گائے میں انتخابات جتوانے کی بڑی غیر معمولی صلاحیتیں ہیں۔ ورنہ ہر بار الیکشن سے چند ماہ پہلے جن سنگھیوں اور مہا بھارتیوں کو گائے کا عشق کیوں ستانے لگتا ہے۔

''7 نومبر کو جب ہزاروں ننگ دھڑ نگ سادھوں نے پارلیمنٹ پر ہلّہ بول کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس ملک کو صرف یہ مسئلہ درپیش ہے کہ گائے کو قصائی کی چھری سے بچالیا جائے۔ عین اسی وقت بہار اور یوپی میں ہزاروں ننّھے ننّھے بچے بھوک کی شدّت سے بلک رہے تھے۔ لاکھوں گائے ہندوستان کے گلی کوچوں میں اپنے وجود کا نا قابل برداشت بوجھ اٹھائے بھوک سے نڈھال ہو رہیں تھیں۔ دِلّی کے فٹ پاتھوں پر ہندوستان کے نئے شہریوں کو جنم دے رہیں تھیں۔ ہسپتالوں کے باہر لاکھوں ہندوستانی نوجوان خون تھوک رہے تھے۔ ملک کے ہر بڑے شہر میں سیتا اور مریم اپنا جسم بیچ رہیں تھیں۔ لیکن دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے والے ان ''انقلابیوں'' کو یہ کچھ دکھائی نہ دیا وہ دیوانہ وار ملک کی سب سے مقدس ایوان پر صرف اس لئے حملہ آور ہوئے کہ ذبیحہِ گاؤ پر پابندی عائد کردی جائے۔

لیکن انسان مرتا ہے تو اسے مرنے دو گائے بھوکی ہے ، بیمار ہے، نحیف و لاغر ہے، تو اس کی کوئی فکر نہیں۔ صرف اس کے ذبح کرنے پر پابندی لگائی جائے۔ یہ سسک سسک کر مر جائے تو کوئی بات نہیں۔ یہ خوراک کے ایک ایک دانے کے لئے تڑپتی رہے تو کوئی غم نہیں۔ لیکن اس کو کوئی ذبح نہ کرنے پائے۔ گائے کے ''تقدّس'' اور ''عظمت'' کو بچانے کے لئے جن سنگھی سورماؤں نے ملک کی عظمت

اور تقدس کو پاؤں تلے روند دیا۔ پیشہ ور ڈاکوؤں کی طرح دلّی کی آبرو لوٹ ڈالی۔اور دہیا ہنستی رہی کہ جواہر لال نہرو کا ہندوستان بھی کیا ہندوستان ہے۔ جہاں انسان تو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے تو اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔لیکن ''گاؤ ماتا'' کی رکھشہ کے لئے ہزاروں بھکاری خون کے پیاسے نظر آتے ہیں۔ہم دنیا کو کیوں کر بتائیں کہ گائے کی رکشا در اصل ایک پر فریب نعرہ ہے۔ یہ صرف آئیندہ انتخابات کی ایک چھوٹی سی کرامت ہے۔''۔۳۸

شمیم اپنے داریوں کے زریعہ حکومت تک عوام کی بات پہنچاتے تھے اور اور عوامی مسائل کا حل بھی اپنے اداریوں کے ذریعہ عوام تک پہنچاتے تھے۔ان کے اداریے اسقدر دم دار ہوتے تھے کہ حکومت بھی ان مسائل پر غورو فکر کرنے کے لئے مجبور ہوتی۔

شمیم احمد شمیمؔ جس موضوع کو اپنے اداریے کا عنوان بناتے تھے اس موضوع سے مکمل معلومات سے آشانا رہتے تھے جس تحریر کو پڑھنے سے ان کے قاری کو کوئی ابہام باقی نہیں رہتا انہوں نے ایسے ہی اداریوں کو تحریر کیا ہے جس پر آپ کو مکمل دسترس حاصل تھی۔ اداریہ کے عنوان کے انتخاب کے بعد اداریہ کے متعلقہ تمام تر معلومات کو بڑے ہی سلیقے سے یکجا کر کے پیش کیا ہے۔ پھر اس کے بعد ان نقاط کو تفصیل سے تحریر میں لایا گیا ہے ان کے اداریوں کا تاثر قابل داد ہے۔شمیم احمد شمیمؔ نے تعارفی پیرا گراف بہتر اور منفرد طریقے سے پیش کیا ہے۔ پڑھنے والا تحریر کو دل جمعی اور توجہ سے پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس لئے ان کے اداریوں کے ابتدائی پیرا گراف کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔کیوں کہ ابتدا میں وہ اپنے میں دلچسپ الفاظ اور دلچسپ معلومات کا عنصر پیدا کرتے ہیں۔اگر کوئی تنقیدی اداریہ ہو تو تمام قسم کے پڑھنے والوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تحریری انداز اپنانے کا ہنر ان کو بخوبی آتا ہے جس سے پڑھنے والے اکتاہٹ اور بیزارگی بھی محسوس نہیں کرتے۔شمیم احمد شمیمؔ نے اپنے اور اپنے اخبار کے خیالات کا اظہار نہایت واضح الفاظ میں کیا ہے۔ زبان نہایت سادہ ہونی چاہئے تا کہ ہر حلقہ کے لوگ آپ کی تحریر کو سمجھ سکیں۔ لمبے اور مشکل پیرا گراف کی بجائے مختصر

اور آسان فہم پیراگرافوں پر توجہ دی گئی ہے کیونکہ اس سے پڑھنے والے پر اچھا تاثر پڑتا ہے۔

شمیم احمد شمیمؔ نے آئینہ کے اداریوں کے ابتدائی حصے میں کم الفاظ میں جامع اور مکمل جانکاری پیش کی ہے۔ جو ابتدا سے ہی پڑھنے والے کی توجہ اپنی طرف راغب رکھتے ہیں اور قاری کی دلچسپی قائم رکھتا ہے شمیم احمد شمیمؔ جب اصل موضوع کو زیرِ بحث لاتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس حصے میں الفاظ یا جملوں میں کسی قسم کی تکرار موجود نہ ہو کیوں کہ جملوں میں تکرار کے سبب قاری کی توجہ کو زائل کرنے کا سبب ممکن ہے اس لئے شمیم احمد شمیمؔ اس سے پرہیز برتتے ہیں وہ اپنا مواد عمدگی اور موضوع کے عین مطابق پیش کرنا اچھی طرح جانتے ہیں تا کہ موضوع اپنی مضبوطی قائم رکھے ان کی وجوہات مناسب، شائستہ اور معقول ہوتی ہیں اور مضمون کے عین مطابق بھی۔ ملاحظہ ہو ان کے ادریے کا ابتدائی حصہ:۔

> ''۱۰ جنوری کو سرزمین تاشقند سے جب ایک چراغ روشن ہوا تو جنگ اور نفرت کی ظلمتیں امن ومحبت کی کرنوں سے پامال ہوگیں۔ اور سہمی ہوئی انسانیت کے چہرے پر زندگی کی آمیز مسکراہٹ کِھل اٹھی، دیوانگی اور غارت گری کے مہیب سائے مٹ گئے اور امید وآرزو کا عنوان لئے ہئے ایک نئ صبح طلوع ہوگئی ہے۔ مگر اس چراغ کو روشن ہوئے پورے تین ماہ بھی نہیں گزرے ہیں کہ اس کی لوتھرتھرانے لگی ہے۔ اور چارون طرف سے بادِ مخالف کے جھونکے اسے بجھانے کے لئے اس پر یلغار کر رہے ہیں۔ عجب نہیں ہے کہ ''چراغ تاشقند'' ان مسموم ہواؤں کی تاب نہ لاکر دم توڑ دے، اور زندگی ایک بار پھر موت اور مایوسی کے اندھیروں میں اپنا راستہ کھو بیٹھے'' ۳۸۔

شمیم احمد شمیمؔ نے ہمیشہ اپنی بات کا لوہا ٹھوس دلائل اور با قاعدہ تحقیق سے منوایا ہے۔ کیونکہ ان کا جس عہد سے اور سماج سے تعلق تھا اس میں اپنی بات کو پیش کرنا اور ثابت کرنا مشکل تھا کیوں کہ وہاں حمائتی کم اور انحرافی زیادہ تھے۔ لہذا اس امر کو ذہن میں رکھ کر اداریوں کی دلیل کو بہتر اور سچا ثابت کیا۔ اپنے ادریے کیا ختتامیہ حصے میں

موضوع کے مطابق واضح نکات پیش کرتے ہیں یہ ان کا پہلو بے حد اہمیت کا حامل ہے۔اس کے علاوہ اپنا موقف واضح کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں، لکھتے ہیں:۔

''پارلیمنٹ کی مراعت کمیٹی کے فرد جرم کا جواب دیتے ہوئے میں نے اپنے تحریری بیان میں بڑے زوردار طریقے پر اپنے موٴقف کی وضاحت کی میں نے ہندوستانی آئین میں درج ''فرد کے بنیادی حقوق'' کا سہارا لے کر معزز ممرانِ پارلیمنٹ پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ مراعات کے مقابلے میں حقوق کو زیادہ فوقیت حاصل ہے اور جب تک ایک صحافی آئین کی حدود کے اندر رہ کر اپنے ''حقوق'' کا ستعمال کرتا رہے گا۔ ملک کی کسی عدالت یا ایوان کو اس کے خلاف کوئی کاروائی کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ میں نے برٹش پارلیمنٹ اور انڈین پارلیمنٹ کے بنیادی فرق کو واضح کرتے ہوئے یہ دعوی کیا کہ ہندوستان میں پارلیمنٹ نہیں، بلکہ اس ملک کا آئین سب سے مقدم اور افضل ہے جب کہ برطانیہ میں پارلیمنٹ کا درجہ آئین اور قانون سے بھی بدتر ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ پارلیمنٹ کی مراعتی کمیٹی (جس میں ملک کے کچھ نامور قانون دان بھی شامل ہیں) نے میرے نقطہ نظر کی صحت کو تسلیم کر کے میرے خلاف پیش کی گئی مراعات شکنی کی تحریک پر کسی قسم کی مزید کاروائی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں اسے اپنی اور'' آئینہ'' کی ہی نہیں بلکہ صحافتی دنیاں کی شاندار فتح تصور کرتا ہوں۔''۳۹

ان کے اداریوں کی اہم بات یہ ہے کہ ان میں ان کے مشاہدہ کا ایک اہم کردار ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا قوتِ مشاہدہ وسیع اور گہرا ہے۔ ذرائع ابلاغ سے گہرا تعلق اور کتب ورسائل اور اخبارات کا مطالعہ ان کی روز

مرّ ہ زندگی میں غذا کی اہمیت رکھتے تھے صرف سن لینا یا پڑھ لینا ہی کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس پر دسترس حاصل کی اوراپنے قلم کا جادو بکھیرا جس تحریر کی خوبصورتی کبھی آئینہ کے اداریوں کی شکل میں سامنے آئی اور کبھی چراغ بیگ کے کالموں کے روپ میں، کبھی خطوط کی شکل میں، گو ہر طرف اپنی تحریر کی داد وتحسین حاصل کی۔

****

ماحاصل

محمد یعقوب کے یہاں 13 جون 1937ء میں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام شمیم احمد رکھا گیا۔ جو بعد میں شمیم احمد شمیم کے نام سے ریاست کے ادبی صحافتی اور سیاسی افق پر روشن ہوا۔ ادبی دنیا میں قدم رکھتے ہی ان کو محکمہ اطلاعات کے زیرِ سایہ میں ماہ نامہ ''تعمیر'' کی ادارت سپرد کی۔ اور کچھ دِنوں بعد شمیم احمد کو فیلڈ پبلیسٹی آفیسر کے عہدے پر ترقی دی گئی، لیکن سرکاری نوکری ان کو راس نہیں آئی اور وہ خود بھی ایک راہ کی تلاش میں تھے۔ بے باکی قدرت نے چونکہ کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس لئے نوکری سے استعفیٰ دے کر مزید تعلیم کی پیاس نے انہیں علی گڑھ یونیورسٹی پہنچایا، اور ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لیا۔ جہاں پر انہیں ایک ایسا ماحول ملا جس کی انہیں تلاش تھی۔

شمیم احمد کی شخصیت ریاست کے ان گنے چنے صحافیوں میں سے تھی جن کو ریاست اور بیرونِ ریاست بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ ۱۹۶۴ء سے جو آئینہ اپنی خدمات انجام دے رہا تھا اس کو ابھی چند ہی سال ہوئے تھے کہ شمیم احمد نے ریاست کے بگڑتے حالات اور سماج کی پسماندگی کو دیکھ کر صرف ''آئینہ'' کی خدمات کو کافی نہ سمجھا۔ اور سیاسی میدان میں کود پڑے۔ جہاں ایک طرف ''آئینہ'' کی خدمت بھی کرتے رہے وہیں دوسری جانب انہوں نے سیاسی میدان میں آ کر قوم کے مستقبل کو بہتر بنانے کی کوشش بھی کی گو کہ تحریری، تقریری اور عملی طور سے ریاست کی عوام کی خدمت کرنے لگے۔ اسمبلی میں سچّائی کی آواز بن کر گرجنے لگے، اور پہلی بار اسمبلی میں کرپشن، ناانصافی، اور ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھائی۔

یہ بات قابل غور ہے کہ شمیم صاحب کے بارے میں راقم نے ثانوی ماخذ کا جتنا بھی مطالعہ کیا۔ اس میں سب نے مرحوم کے اوصاف ہی گنائے اور وہ شخصیت تھی بھی تعریف کے قابل ہی لیکن آخر کوئی شخص دنیا میں حضرت محمد ﷺ کے بغیر مکمل نہیں اس سلسلے میں جب شمیم صاحب کی تحریروں کو یعنی بنیادی ماخذ اور ان کے افکار وخیالات کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی تو بعض موقعوں پر ان سے اتفاق نہ ہو سکا۔ جہاں وہ ایک طرف کشمیری قوم کی بلندی اور کامیابی کے خواب دیکھتے تھے وہیں شمیم صاحب کشمیر کی ثقافتی اور تہذیبی زندگی کے بارے میں مرحوم کے جو خیالات و تاثرات تھے ان سے میرا اختلاف ہے اور دوسری بات یہ کہ شمیم صاحب کی سب سے بڑی کمزوری ہ تھی کہ وہ اپنے مخالف کو نیچا دیکھانے میں کسی بھی حد تک جانے کے لئے فوراً کمر بستہ ہو جاتے اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ کئی احباب

کواس کے دشمنوں میں تبدیل کرنے کا باعث بن گیا۔لیکن اگر وقت پہ ضرورت پڑتی تو دشمن کے بھی کام آجاتے گر چہ وہ جانی دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

آئینہ کا اجرا ۱۹۶۴ء میں ہوا اس کا پہلا شمارہ ۲۰ جولائی ۱۹۶۴ء کو شائع ہوا۔''آئینہ'' سن ۱۹۶۴ سے اپنا سفر شروع کرتا ہے یہ وہ دور تھا جب ریاست میں کئی نئے نئے اخبارات جنم لے رہے تھے۔شمیم احمد آخر سن ۱۹۶۴ء میں بڑی جدو جہد کے بعد اس منزل پر جا پہنچے ''آئینہ'' کی منظوری مل گئی اور عوام کی خدمت کا موقع مل گیا۔آئینہ ہفت روزہ نے کل گیارہ سال اپنی خدمات انجام دیں۔۱۳ اگست ۱۹۷۵ء میں آئینہ ہفت وار رآئینہ سے روزنامہ میں تبدیل ہوا اور پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا۔ ہفتہ وار آئینہ میں چراغ بیگ کی جگہ کوہ کن نے سنبھال لی۔ چراغ بیگ کے نقش وقدم پر چل کر کوہ کن نے بھی اہم اور سنجیدہ موضوعات کے علاوہ آئے دن کے واقعات وحادثات کو بڑی بے باقی سے پیش کرنے کی کوشش کی۔

روزنامہ ''آئینہ'' میں ش،احمد کے نام سے بصیرت افروز کالم اور اداریے لکھے جاتے تھے۔ ''ہفتہ ور آئینہ'' اور ''روزنامہ آئینہ'' اپنے مزاج ،کردار، اور مقاصد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔شمیم احمد خود کہتے ہیں ''ہفت روز'' آئینہ'' میرا اخبار تھا اور روزنامہ ''آئینہ'' تمہارا اخبار ہے اردو ادب کے سرمایہ میں پچھلے پچاس سالوں سے اردو خاکہ نگاری پر اور اس کے آغاز وارتقاء پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔لیکن افسوس کی بات ہ ہے کہ کسی ادیب یا نقاد نے شمیم احمد کی خاکہ نگاری کا ذکر نہیں کیا۔میرے نزدیک اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ ہمارے نقادوں اور ادیبوں نے ان کو نظرانداز کیا اور ان کی خاکہ نگاری شامل نہ کیا۔دوسری بڑی وجی یہ تھی کی شمیم احمد کی تمام تحریریں ''آئینہ'' کی تہوں میں دبی پڑی تھیں۔جن کو'' آئینہ'' کے ساتھ ہی گم نامی اختیار کرنی پڑ رہی تھی۔آئینہ'' میں چراغ بیگ کے نام سے کم وبیش دو دہائیوں تک مسلسل کالم نویسی کی ان کی پہچان چراغ بیگ کی کالم نگاری ہی رہی اور اسی شعبے کو انھوں نے اوّلیت بھی دی۔

شمیم احمد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرنے کے لئے راقم نے ایڈوکیٹ ظفر معراج سے ملاقات کی جن کی زندگی کا بیشتر حصہ شمیم احمد شمیم کے ساتھ گزرا ہے۔جو کہ شمیم صاحب کے بھانجے ہیں ان سے شمیم کی شخصیت اور زندگی کے متعلق کئی ایک سوالات کئے۔ اور ان کے مطعلق جانکاری حاصل کی۔شمیم احمد شمیم بیماری کی

وجہ سے پہلے ممبئ کے ہسپتالوں میں داخل رہے اور بعد میں لندن چلے گئے ۔لیکن بیماری نے شمیم کو نہ بخشا۔ بیماری کے آخری ایّام میں ان کی تکلیف اور بھی زیادہ بڑھ گئی ۔۔ جیسے جیسے تکلیف بڑھتی گئی ان کا عظم اور حوصلہ بھی جوان ہوتا گیا۔

۳۰ اپریل سن 1980ء کو اپنے اہل خانہ کو ایک گہری نظر سے دیکھ کر انہیں صبر وضبط، غیرت، بہادری، اور جرأت کا ابدی پیغام دے کر اس فانی دنیا کو ۴۳ سال کی عمر میں خیر آباد کہ دیا۔اس کے بعد ایک لمبے عرصے تک شمیم احمد شمیمؔ کا نام ایک گم صم تے خانے میں رہا۔ان کے اخبارات تقریباً 3 دہائیوں تک الماریوں کی دھول کھاتے رہے اس کے اصلی شماروں کو راقم نے حاصل کرنے کے لئے بڑی کوشش کی لیکن صرف چند شمارے ہی حاصل کر پایا۔

قراۃ العین صاحبہ جو شمیم احمد کی ہمشیرہ ہیں انہوں نے ان کی تمام تر تحریروں کو جمع کر کے ان کو شائع کرنے کا کام انجام دیا ہے۔اور ابھی تک ان کی ''آئینہ نماء'' نام سے تقریباً 13 جلدیں منظرِ عام پر آ چکیں ہیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ اس دانشور پر آج تک کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا بجز کشمیر یونیورسٹی میں ایک ایم فل کا مقالہ شمیمؔ احمد کی شخصیت پہ لکھ گیا ہے۔ جو کسی بھی طرح سے اس دانشور کی شخصیت اور صحافت کے لئے نا کافی ہے ۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے اتنے بڑے صحافی اور دانشور پر تحقیقی کام کرنے کا موقع ملا اور میں نے تن من دھن سے اس تحقیقی کام کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی ۔اس کے لئے مجھے شمیم کے دوستوں سے، گھر کے لوگوں سے، ملنے کا موقع ملا، اور اپنی تحقیق کے حوالے سے جانکاریاں حاصل کی امید ہے کہ آپ کو یہ میرا تحقیقی کام پسند آئے گا۔

****

۔حوالہ جات۔

ا۔''ہفت روزہ آئینہ''فروری 1967ء اعتراف شکست کالم سے ،شمارہ نمبر۳۶ ،مشمولہ۔آئینہ نماء (باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر)،جلد۳۔ص۵۶

۲۔محمد رضوان(مضمون) آبلہ پائی کے سفر کا پرعزم مسافر۔مشمولہ شیرازہ (شمیم احمد شمیم نمبر)جموں اینڈ اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز ،سرینگر،۔ص۔۱۲۳۔

۳شوریدہ کاشمیری،کشمیر کا بھٹو، مشمولہ، شیرازہ (شمیم احمد شمیم نمبر) جموں اینڈ اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز ،سرینگر،۔ص۱۴۶

۴۔شہریار(مضمون)اچھے شاعر تو جوانی میں ہی مرا کرتے ہیں،مشمولہ،شیرازہ(شمیم احمد شمیم نمبر)جموں اینڈ اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز ،سرینگر،۔ص۔۱۵۷

۵۔شیرازہ شمیم احمد شمیم نمبر۔ص۱۸۹

۶۔عبدالغنی شیخ (مضمون) سراپا احتجاج ،مشمولہ،شیرازہ (شمیم احمد شمیم نمبر)جموں اینڈ اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز ،سرینگر،۔ص.188

۷۔غلام رسول ملک (مضمون) شمیم صاعقہ شعلہ وسیماب۔مشمولہ۔شیرازہ (شمیم احمد شمیم نمبر)جموں اینڈ اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز ،سرینگر،ص۱۹۱

۸۔کرشن چندر مضمون''چھٹتا نہیں ہے منہ سے کافر لگا ہوا۔مشمولہ،شیرازہ (شمیم احمد شمیم نمبر)جموں اینڈ اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز ،سرینگرص224

۹۔گوپی چند نارنگ،خوابوں کا سوداگر،مشمولہ، شیرازہ (شمیم احمد شمیم نمبر) جموں اینڈ اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز ،سرینگرص۔۲۳۱

۱۰۔آئینہ۔۱۹۶۸۔مشمولہ،اائینہ نماء۔جلد۔۷ص۳۷

۱۱آئینہ (کالم) ''یہ اخبار کس کا ہے''۔یکم جولائی ۱۹۶۸ء مشمولہ۔آئینہ نماء (باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر)،جلد۱۔ص۴

۲

۱۱ آئینہ۔۱۵ جولائی ۱۹۷۰ء مشمولہ۔آئینہ نماء (باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر،۔جلد دوم۔ص۔۱۴۴

۱۳ آئینہ۔۱۵ جولائی ۱۹۷۰ء مشمولہ۔آئینہ نماء (باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر،۔جلد دوم۔ص۔۱۴۵

۱۴ اوزنامہ آئینہ۔۱۹۷۶ء مشمولہ آئینہ،۔آئینہ نماء (باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر، جلد ۱۱۔ص ۲۴۳

۱۵۔اوزنامہ آئینہ۔۱۹۷۶ء مشمولہ آئینہ،۔آئینہ نماء (باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر، جلد ۱۱۔ص ۲۴۷

۱۶۔وزنامہ آئینہ۔۱۹۷۶ء مشمولہ آئینہ نماء (باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر، جلد ۱۱۔ص ۲۴۳

۱۷۔وزنامہ آئینہ۔۱۹۷۶ء مشمولہ۔آئینہ نماء (باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر، جلد ۱۲۔ص ۲۴

۱۸۔قراۃ العین۔آئینہ نماء (باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر، جلد ۱۲۔ص ۳۴

۱

۱۹۔۔خلیق انجم، شمیم خاکہ نگار۔مشمولہ شیرازہ (شمیم احمد شمیم نمبر) جموں اینڈ اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر،۔ص۔۸۶

۲۰۔خلیق انجم، شمیم خاکہ نگار، شیرازہ (شمیم احمد شمیم نمبر) جموں اینڈ اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر،۔ ص۔۸۶

۲۱۔ا۔قراۃ العین۔آئینہ نماء (باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر، جلد ۴، ص ۶۳

۲۲۔قراۃ العین، آئینہ نماء (باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر،۔جلد نمبر ۴ ص ۶۳

۲۳۔قراۃ العین، آئینہ نماء (باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر،۔جلد نمبر ۴ ص ۶

۲۴۔اۃ العین،آئینہ نما‎ء(باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر،۔۔جلد نمبر۴ص ۴۷

۲۵۔قراۃ العین،آئینہ نما‎ء(باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر)جلد ۵،ص ۴۷

۲۶۔قراۃ العین،آئینہ نما‎ء(باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر،۔جلد ۴،ص ۴۹

۲۷۔آئینہ، اگست 1968ء۔مشمولہ۔قراۃ العین،آئینہ نما‎ء(باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر،۔ جلد ۷ص 53

۲۸۔آئینہ ہفت روزہ 31 جولائی 1972ء

۲۹۔آئینہ۔15 مئی .1970ء،مشمولہ،قراۃ العین،آئینہ نما‎ء(باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر جلد،۹،ص۔126

۳۰ہفت روزہ آئینہ،(کالم)چراغ بیگ کے قلم سے۔21 مئی 1965،مشمولہ،آئینہ نما جلد نمبر 11 ص 125

۳۱ہفت روزہ آئینہ۔15 اپریل 1970ء۔مشمولہ،قراۃ العین،آئینہ نما‎ء(باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر،جلد اول۔ص ۱۱۵

۳۲۔(رہبر اخبار نویسی۔ص۸۱۳)نوٹ۔کتاب کے ناقص الطرفین ہونے سے مصنف کا نام اور جائے اشاعت کا حوالہ دینے سے قاصر ہوں

۳۳۔ڈاکٹر عبدالسلام خورشید،اردو صحافت نظر عمل،انٹرنیشنل اردو پبلیکیشنز ص ۳۹۲)

۳۴۔آئینہ۔ .1967 مشمولہ۔قراۃ العین،آئینہ نما‎ء(باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر،جلد نمبر۔6ص .218

۳۵۔آئینہ 1966ء۔مشمولہ،قراۃ العین،آئینہ نما‎ء(باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر جلد نمبر چھ

۳۶۔آئینہ(اداریہ)۔ہوشیار۔۸ستمبر ۱۹۶۴

۳۷۔آئینہ اداریہ۔طالب علموں کی نظر بندی۔مشمولہ،قراۃ العین،آئینہ نما‎ء(باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر 31 جنوری .1966

۳۸۔آئینہ .1964ء ۔مشمولہ،قراۃالعین،آئینہ نماء(باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال برزلہ سرینگر
جلدنمبر 3 ص132
۳۹۔ئینہ،(اداریہ)۳۱مارچ۱۹۶۶ء۔مشمولہ،قراۃالعین،آئینہ نماء(باغات برزلہ،نزدیک بون اینڈ جوانٹ ہسپتال
برزلہ سرینگر۔جلدنمبر۳ص۸۲

****

کتابیات۔

۱۔قراۃ العین، آئینہ نماء(باغاتِ برزلہ نزد بون اینڈ جوانٹ ہسپتال، برزلہ، سرینگر کشمیر۔جلد۔اوّل، جون ۲۰۰۰ء

۲۔قراۃ العین، آئینہ نماء(باغاتِ برزلہ نزد بون اینڈ جوانٹ ہسپتال، برزلہ، سرینگر کشمیر۔جلد۔دوم، ۲۰۰۱ء

۳۔قراۃ العین، آئینہ نماء(باغاتِ برزلہ نزد بون اینڈ جوانٹ ہسپتال، برزلہ، سرینگر کشمیر۔جلد۔سوم، ۲۰۰۳ء

۴۔قراۃ العین، آئینہ نماء(باغاتِ برزلہ نزد بون اینڈ جوانٹ ہسپتال، برزلہ، سرینگر کشمیر۔جلد۔چہارم، ۲۰۰۴ء

۵۔قراۃ العین، آئینہ نماء(باغاتِ برزلہ نزد بون اینڈ جوانٹ ہسپتال، برزلہ، سرینگر کشمیر۔جلد پنجم ۔۲۰۰۵ء

۶۔قراۃ العین، آئینہ نماء(باغاتِ برزلہ نزد بون اینڈ جوانٹ ہسپتال، برزلہ، سرینگر کشمیر۔جلد ششم ۲۰۰۷ء

۷۔قراۃ العین، آئینہ نماء(باغاتِ برزلہ نزد بون اینڈ جوانٹ ہسپتال، برزلہ، سرینگر کشمیر۔جلد ہفتم ۔۲۰۰۸ء

۸۔قراۃ العین، آئینہ نماء(باغاتِ برزلہ نزد بون اینڈ جوانٹ ہسپتال، برزلہ، سرینگر کشمیر۔جلد ہشتم ۲۰۱۰ء

۹۔قراۃ العین، آئینہ نماء(باغاتِ برزلہ نزد بون اینڈ جوانٹ ہسپتال، برزلہ، سرینگر کشمیر۔جلد۹۔۲۰۱۱ء

۱۰۔قراۃ العین، آئینہ نماء(باغاتِ برزلہ نزد بون اینڈ جوانٹ ہسپتال، برزلہ، سرینگر کشمیر۔جلد۱۰۔۲۰۱۲ء

۱۱۔قراۃ العین، آئینہ نماء(باغاتِ برزلہ نزد بون اینڈ جوانٹ ہسپتال، برزلہ، سرینگر کشمیر۔جلد۱۱۔۲۰۱۴ء

۱۲۔قراۃ العین، آئینہ نماء(باغاتِ برزلہ نزد بون اینڈ جوانٹ ہسپتال، برزلہ، سرینگر کشمیر۔جلد۱۲۔۲۰۱۷ء

۱۳۔قراۃ العین، آئینہ نماء(باغاتِ برزلہ نزد بون اینڈ جوانٹ ہسپتال، برزلہ، سرینگر کشمیر۔جلد۱۳۔۲۰۱۸ء

۱۴۔شیرازہ، شمیم احمد شمیم نمبر، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگوئجز ۔سرینگر۔۲۰۰۹ء

۱۵۔محمد یوسف ٹینگ، ''کشمیر میں اردو تاریخی پس منظر'' ہماری زبان نئی دہلی ۔۱۹۸۵ء

۱۶۔عبدالحق نعیمی، ''اردو تنقید مین ریاستی ناقدین کا حصہ۔'' شیرازہ، خصوصی شمارہ، ''جمون و کشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال'' جولائی ۱۹۹۸ء

۱۷۔امداد امام صابری۔تاریخِ صحافت اردو۔جلد سوم۔

۱۸۔امداد امام صابری۔تاریخِ صحافت اردو۔جلد چہارم۔

۱۹۔نندلال واتل۔''ریاست جموں و کشمیر میں اردو صحافت'' ماہنامہ آجکل۔نئی دہلی جولائی، ۱۹۸۵ء

۲۰۔یوسف جمیل، ''آدابِ صحافت اور ہمارے اخبارات''۔نوائے صبح، سرینگر۔یکم اکتوبر ۱۹۸۳ء

۲۱۔ہفت روزہ آئینہ۔ ۱۹٦۸ء شمارہ نمبر، ۵٦۔

۲۰۔روزنامہ آئینہ، ستمبر ۱۹۷۷ء شمارہ نمبر، ۱۹۸۔

۲۱۔ردو صحافت کا سفر، گربچن چندن ایجوکیشنل بک ہاوس دہلی۔ ۲۰۰۷ء

۲۲۔جموں وکشمیر میں اردوادب کی نشونما، ڈاکٹر برج پریمی، دیپ پبلیکیشر سری نگر۔

۲۳۔کشمیر میں اردو، پروفیسر عبدالقادر سروری، جے کے اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز۔سری نگر۔۱۹۹۳ء

۲۴۔صحافت اور صحافی۔ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم۔تنویر پبلیشرز حیدرآباد۔۲۰۱۷ء

☆☆☆☆